# کراچی سے
# خیبر تک

## حسین حسنی

ابتدائیہ: ڈاکٹر سیّد ابوالخیر کشفی

4040

مکتبۂ زیتون ۱-کے-۳- ناظم آباد مینشن
نزد برف خانہ - ناظم آباد ۲ کراچی ۱۸

Marfat.com

# کراچی سے
# خیبر تک

(رپورتاژ)

حسین حسنی

## ابتدائیہ
پروفیسر ڈاکٹر سیّد ابوالخیر کشفی

مکتبہ زیتون
اسکے۔۳ ناظم آباد مینشن۔ ناظم آباد ۱ کراچی ۱۸

Marfat.com

87309

جملہ حقوق طباعت واشاعت
بحق فضل ربی ندوی محفوظ ہیں

87309


| | | |
|---|---|---|
| نام کتاب | ——— | کراچی سے خیبر تک |
| مصنف | ——— | حسین حسنی |
| سال اشاعت | ——— | سنہ ۱۹۹۱ء |
| تعداد | ——— | ایک ہزار |
| مطبوعہ | ——— | شکیل پرنٹنگ پریس کراچی |
| قیمت | ——— | روپے |

ناشر
فضل ربی ندوی

مکتبہ زیتون
۱۔کے۔۳ ناظم آباد مینشن ناظم آباد ۱ کراچی


Marfat.com

# ترتیب


عرض مسافر ۶

ابتدائیہ ۹

(۱)

روانگی ۱۴

کنارِ سندھ

موھنجوڈارو ۲۵

نندُیرو ۳۴

سکھر ۳۸

ستلج پار ۵۲

ملتان ۵۲

ٹیکسلا ۶۴

حسن ابدال ۷۸

اٹک ۸۸


Marfat.com

اٹک پار ۹۴

پشاور کینٹ ۹۴

درۂ خیبر ۱۰۳

(۲)

واپسی ۱۱۴

کنار راوی ۱۲۸

لاہور ۱۲۸

حیدرآباد ۱۶۹


Marfat.com

# انتساب

ممّو بھیّا کے نام

Marfat.com

# عرض مسافر

خواجہ احمد عباس نے ۱۹۳۸ء میں دوسری جنگ عظیم سے قبل دنیا کے گرد ایک چکر لگایا تھا۔ اس سفر کی روئیداد "مسافر کی ڈائری" کی شکل میں منصہ شہود پر آئی۔ یہ سفر پانی کے جہاز سے کیا گیا تھا۔ اور حسب ضرورت کہیں کہیں ریل سے یا موٹر سے۔ وہ ۲۸ جون کو بمبئی سے روانہ ہوئے اور کولمبو، سنگاپور، ہانگ کانگ شنگھائی۔ ٹوکیو۔ وانکور۔ لاس انجلیز، نیویارک، لندن، پیرس، ہیونج بڈاپسٹ، قسطنطنیہ، انقرہ، بغداد ہوتے ہوئے ۲۴، نومبر کو کراچی اور پھر واپس بمبئی پہنچ گئے۔

میں نے یہ ڈائری اپنے بچپن میں پڑھی تھی۔ انتہائی دلچسپ معلومات افزا اور سحر انگیز — اس نے مجھے بڑا متاثر کیا تھا۔ دوران سفر میں نے بھی طے کر لیا تھا۔ کہ واپسی پر میں بھی اپنے سفر کے تاثرات اور حالات تقریباً اسی انداز میں تحریر کروں گا۔ آتے ہی لکھنا شروع کر دیا اور جب ختم کر چکا تو ابراہیم جلیس کے پاس لے گیا۔ انہوں نے پڑھا اور بہت پسند کیا — رپورتاژ کا نام "کراچی سے خیبر تک" انہیں نے تجویز کیا۔

پاکستان کو وجود میں آئے صرف تین سال ہوئے تھے۔ کیا وقت تھا کیا حالات تھے؟ — آج کے دور میں تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ اسلام آباد کا تصور۔ تربیلا ڈیم۔ وارسک ڈیم۔ اور منگلا ڈیم کا تصور کون کر سکتا تھا کوڑی

Marfat.com

بیراج۔ اور سندھ یونیورسٹی۔ پشاور اور دیگر یونیورسٹیاں خواب و خیال میں بھی نہ تھیں۔ لنڈی کوتل اور باڑا مارکیٹوں کا کہیں وجود نہ تھا۔ موہنجوڈارو میں نہ تو ائیر پورٹ تھا۔ اور نہ کوئی سڑک ۔ نہ کوئی ہوٹل۔

یہ سفر کن حالات اور کس طرح کیا گیا؟ ۔ آج کل ائیر کنڈیشن ڈبے قبل از وقت سیٹ کی بکنگ، جگہ جگہ اعلےٰ درجے کے ہوٹل، ٹورسٹ ڈپو لیمیٹڈ کارپوریشن کی مہیا کی ہوئی آسانیاں اور آسائشیں۔ لہٰذا تفریحی سفر نہایت پرلطف، دلچسپ اور آرامدہ ۔ ہمیں تو لمبا اوقات پلیٹ فارم پر کھلے آسمان کے نیچے سونا پڑا اور پھوس کے ہوٹل میں دال روٹی اور کچی پیاز کھانا پڑی ۔ کہیں چھولے اور کہیں مرچوں بھرے کباب۔

اس رپورتاژ میں کہیں کہیں غیر مانوس جغرافیائی اصطلاحات، آب و ہوا، زمین کی بناوٹ۔ پہاڑوں اور چٹانوں کی ساخت کا تذکرہ ملے گا۔ یہ میرے جغرافیہ سے شوق اور شغف کا نتیجہ ہے۔

یہ رپورتاژ میری پہلی کاوش بھی ہے جو اشاعت پذیر ہوئی۔ لہٰذا زبان و بیان میں ناپختگی اور کہیں کہیں معیار سے گراوٹ کا ہونا لازمی ہے۔ مجھے بھی اس کا احساس ہے۔ مگر میں اپنی اس چالیس سال قبل کی تحریر کو تبدیل کرنے پر ہرگز تیار نہیں۔

بھلا ہو یارانِ اردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق کا ۔ اور جناب شجاع احمد زیبا کا ۔ انہوں نے میری ہمت افزائی فرمائی اور اپنے پندرہ روزہ رسالہ "قومی زبان" میں اس رپورتاژ کو جگہ دی اور یہ ۱۶ دسمبر ۱۹۵۱ء

Marfat.com

تا یکم مارچ ۱۹۵۲ء تک قسط وار شائع ہوتا رہا۔ مگر بعض ناگزیر وجوہ کی بنا پر چھ اقساط شائع ہونے کے بعد یہ سلسلہ منقطع کر دیا گیا۔ اس کے بعد پھر دوبارہ اشاعت کی نوبت نہ آئی۔ بہر حال اب اڑتیس سال بعد مکمل کتابی صورت میں شائع ہو کر ہدیۂ ناظرین ہے۔

میں محترم ڈاکٹر سید ابوالخیر کشفی صاحب کا شکر گزار ہوں کہ انھوں نے اس کو شروع سے آخر تک ملاحظہ کر کے اپنی رائے قائم کی اور اپنے گراں قدر ابتدائی کلمات اظہار فرمائے۔

میں جناب فضل ربی صاحب کا بھی بڑا ممنون ہوں جنھوں نے اس رپورتاژ کی طباعت کا اہتمام کیا اور تمام اخراجات برداشت کئے۔ ورنہ یہ مخطوطہ ہی رہ جاتا۔

Marfat.com

# ابتدائیہ

## پروفیسر ڈاکٹر سیّد ابوالخیر کشفی

جناب حسین حسنی ایک غیر پیشہ ور ادیب ہیں۔ اسی لیے لکھنا ان کا مسئلہ ان معنوں میں نہیں جن معنوں میں پیشہ ور ادیبوں کا ہوتا ہے۔ وہ ایک حسّاس اور بے غرض آدمی ہیں اور یہی دونوں باتیں انہیں لکھنے پر مجبور کرتی ہیں۔ وہ دیدۂ بیدار کے مالک ہیں اپنے گرد و پیش جو کچھ دیکھتے ہیں اُسے اور اُس کے اسباب کو قلم بند کرنے کے لیے وہ بے چین ہو جاتے ہیں۔ اسی طرح وہ اپنے علم اور مطالعے میں دوسروں کو شریک کرنے کے لیے قلم اٹھاتے ہیں۔ زیرِ نظر کتاب بنیادی طور پر ان کے احساس اور مشاہدے سے تعلق رکھتی ہے۔

"کراچی سے خیبر تک" کو جناب حسین حسنی نے "رپورتاژ" کا نام دیا ہے رپورتاژ یقیناً ایک مستقل صنف ادب ہے۔ اس میں کسی واقعہ کی رپورٹنگ اس انداز سے کی جاتی ہے کہ وہ صحافت کی سطح پر بلند تر ہو کر ادب کی قلمرو میں شامل ہو جائے کہ اُردو میں یہ اصطلاح کرشن چندر کے "پودے" سے شروع ہوئی جو ترقی پسند مصنفین کی حیدرآباد کانفرنس کی روئداد کا عنوان ہے۔ اس میں حقیقت، افسانوی اسلوب میں پیش کی گئی ہے۔ حسنی صاحب نے اُسی زمانے میں یہ سفرنامہ تحریر کیا اور نئی نئی مقبول

Marfat.com

ہونے والی اصطلاح کو قبول کر لیا۔ میرے خیال میں اسے سفرنامہ قرار دینے میں کوئی ایسا مضائقہ نہیں۔

"کراچی سے خیبر تک" ـــــ یہ سفرنامہ ۱۹۵۰ء میں لکھا گیا اور کوئی چالیس سال کے بعد شائع ہو رہا ہے۔ چالیس سال کی مدت خاصی طویل ہوتی ہے۔ اس مدت میں بہت سی شائع ہونے والی کتابیں اپنی اہمیت کھو بیٹھتی ہیں، مگر اس سفرنامے کی اشاعت کو رسمی یا بعد از وقت قرار نہیں دیا جا سکتا۔ اس سفرنامے میں کئی ایسے مشاہدے اور تبصرے ہیں جو آج کے حالات اور تناظر میں لکھنے والے کی پیش بینی کی دستاویزی شہادتوں کا درجہ رکھتے ہیں اسی کے ساتھ ساتھ یہ سفرنامہ اُن لوگوں کے لئے اپنے وطن کے ماضی اور حالات کو سمجھنے کے لئے ایک رہنما کا درجہ رکھتا ہے جو بعد میں پیدا ہوئے اور جن کے سامنے آج کا پاکستان ہے۔ آج جب وطن عزیز کے کئی حصّوں میں دو نوجوان یوں ہی سیر و تفریح کے لئے نہیں نکل سکتے کہ جان کا خطرہ ہر قدم پر دل کی دھڑکنوں کو تیز کرتا رہے گا۔ آج رات بے رات ذوقِ سیر و تماشا کی تسکین کے لئے کوئی ریل کی پٹڑیوں کے ساتھ ساتھ قطعِ راہ نہیں کر سکتا۔ اس سفرنامہ کو وہ لوگ بھی بہت دلچسپی کے ساتھ پڑھیں گے جنہوں نے پانچویں عشرہ میں حسین حسنی اور "ممو بھیا" کے ساتھ یوں ہی پاکستان کا سفر کیا تھا اور نت نئے مقامات دیکھے تھے اور لوگوں سے شناسائی یا دوستی پیدا کی تھی۔ ایسی شناسائی کہ وہ لوگ جن سے ملاقاتیں ہوئیں۔ اگرچہ اپنے ناموں سے محروم ہیں، مگر مسافروں کی زندگی کے کرداروں میں شامل ہیں۔

مجھے بھی آخر الذکر زمرہ میں شامل سمجھیئے۔ اسی زمانے میں اور اس کے کچھ بعد انہیں علاقوں میں میں نے جیپ کے ذریعہ سفر کئے، کراچی سے پشاور تک، حسنی

Marfat.com

صاحب نے کتنے ہی مقامات کا ذکر یوں کیا ہے کہ میرے ذہن میں بھی وہ مقامات روشن ہو گئے۔ انہوں نے میرے لئے بھی وقت کی گرفت کو اپنے قلم سے دور کر دیا۔ بہت سے مناظر اور مقامات جو دھندلا گئے تھے نقش تازہ بن گئے۔ میرا خیال ہے کہ نئی نسل بھی اس سفرنامے کو دلچسپی کے ساتھ پڑھے گی اور اُس ترقی کو بہتر طور پر سمجھ سکے گی جو معیشت و صنعت کے میدان میں اس ملک نے کی ہے۔ نئی نسل کو اس کا اندازہ بھی ہو سکے گا کہ مسافر نواز بہتیرے" کی بات محض شاعری نہیں بلکہ ہماری زندگی کی حقیقت بھی تھی۔

میں نے حسنی صاحب کی پیش بینی کا تذکرہ کیا ہے۔ حسنی صاحب نے عام سندھی کی محرومی کو اپنے دل میں چبھنے والے کانٹے کی طرح محسوس کیا ہے۔ آج سندھ اور سندھی کے استحصال کا تذکرہ ہر طرف چھڑا ہوا ہے ان دنوں عام سندھی کا حالِ زار ہمارے سامنے تھا، مگر عمومی خیال یہی تھا کہ یہ غریب احتجاج کرنے کے لائق نہیں۔ اور آج یہ تاثر بھی ہے کہ سندھی عوام کا استحصال غیر سندھیوں نے کیا ہے۔ اس میں جزوی صداقت ہے، مگر بنیادی سچ یہ ہے کہ سندھ کے عام آدمی اور ہاری کو سندھ کے وڈیروں اور جاگیرداروں نے انسان نہ جانا، اُن کے بازوؤں کی محنت اور عزّت و حرمت کو اپنے استعمال اور وہ بھی بے مزد استعمال کی چیز سمجھا۔

حسنی صاحب نے ایک واقعہ کے پس منظر میں مستقبل کو یوں دیکھ لیا۔

"سندھی..... ایک پکا ہوا پھوڑا ہے۔ اُس کو جب چاہو چھیڑ دو وہ پھوٹ کر بہہ جائے گا۔ کیا معلوم وہ کبھی ایسا بھی بہے کہ سیلاب آ جائے جس میں ہزاروں موہن جوڈارو بہہ جائیں۔ کون جانے یہ کب ہو گا!"

Marfat.com

اور یہ ہوا۔ ہماری ہی زندگی میں۔ ہماری آنکھوں کے سامنے۔ آج کے غیر محفوظ راستے قومی شاہراہ پر ڈاکے، قصبوں اور بستیوں میں موت کے سائے۔ کون جانے پر منظر نامہ کب بدلے گا۔

حسنی صاحب کا سفر نامہ بہت رواں دواں ہے۔ کہیں رفتار تیز ہے کہیں آہستہ۔ ریل، بس اور پیدل سفر کی رفتار مختلف ہی ہوتی ہے۔ اس سفر میں پڑاؤ بھی آتے ہیں۔ اور قیام کے وہ وقفے جن میں مسافر قدیم تہذیبوں کو بھی دیکھتے ہیں اور زندہ ناچ گانا بھی۔ "زندہ ناچ گانے" کی اصطلاح بہت دنوں کے بعد پڑھی اور زندگی کا پرانا اسلوب ذہن میں تازہ ہو گیا، بائس کوپ کے بعد فلم اور سینما کی اصطلاحیں رائج ہوئیں۔ سینما کا لفظ فلم کے لئے استعمال ہوتا تھا اور قصباتی سینما گھروں میں فلم کے ساتھ زندہ ناچ گانے کا پیوند لگایا جاتا تھا، جس میں وہ فحش اشارے اور کنائے ہوتے کہ دیکھنے اور سننے والوں کے ماتھے پر پسینہ آجاتا۔

سندھ کے مقامات اور مناظر، ملتان کے مزارات اور وہاں اگربتی کی خوشبو اور اُس کا دھواں، پنجاب کا بٹیا اور اس کا المیہ، ٹیکسلا اور وہاں تہذیبوں کا سنگم پٹھانوں کی خودداری اور ایک بچے کو کچھ دینے پر احتجاج کہ اسے بھیک لینا نہ سکھاؤ اس کتاب کے صفحات پر ایسی بہت سی تصویریں ہیں۔ یہ سفر نامہ ایک مرقع ہے مناظر اور کرداروں کا۔ اس کے کردار ہمارے ذہن میں جیسے اپنی جگہ بنا لیتے ہیں۔

اشرف خاں ـــ ایک ننھا پٹھان ـــ اور سرحد کے علاقے میں ایک مہاجر 'ہوٹن' (کیفے ڈی پھونس) کے مالک جو مظفر نگر سے نکلے تو ایک ویرانے میں رزق اُن کے لئے مقدر کر دیا گیا۔ یہ صورتِ حال انسانی زندگی میں نئی نہیں بلکہ یوں ہی انسان

Marfat.com

نقلِ مکانی کرتا رہا ہے اور یوں انسانی تہذیب کا مطالعہ پیچ دار مشکل ہوتا گیا ہے۔ انہیں کرداروں میں شہرۂ آفاق گاماں پہلوان بھی ہیں جن کو بڑی دردمندی کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ میں حوالے پیش کر کے اس تبصرے کو طویل بنانا نہیں چاہتا۔ ویسے بھی کتاب مختصر ہے اور یہ سارے مناظر تیزی کے ساتھ آپ کے سامنے آجائیں گے۔ حسنی صاحب کا یہ سفرنامہ ہمارے لئے وقت اور مقامات کا سفر بن جاتا ہے۔ ماضی زندہ ہو کر ہمارا حال بن جاتا ہے اور ہم اپنے آپ کو مصنف کے ساتھ مصروفِ سفر پاتے ہیں۔

یہ سفرنامہ حسنی صاحب کی پہلی کاوش ہے اور انہیں بہت عزیز ہے۔ اسی لئے انہوں نے اس پر نظرِ ثانی نہیں کی ورنہ زبان کو کئی جگہ بہتر بنایا جا سکتا تھا۔ ویسے یہ اچھا ہی ہے کہ ادبی اسلوب کا رنگ زیادہ نمایاں نہیں کیا گیا۔

یہ سفرنامہ میرے کہنے سے جناب فضل ربی شائع کر رہے ہیں اور میری یہ سفارش ایک ادبی سفارش ہے۔ میری خواہش ہے کہ آج کے پڑھنے والے اپنے ماضی قریب کو ایک باشعور مسافر کی ہم سفری میں سمجھیں۔ یہ سفرنامہ جیسا کہ عرض کیا گیا۔ ایک مرقع ہے اور کسی البم کی اہمیت اور دلچسپی کبھی ختم نہیں ہوتی۔ البم کی تصویریں ماضی کو زندہ کر دیتی ہیں۔

سیّد ابوالخیر کشفی
۱۹، نومبر ۱۹۹۰ء

Marfat.com

(۱)

# روانگی

Marfat.com

۱۵

# روانگی

بارہ بج کر پینتالیس پر کوئٹہ میل نے کراچی چھوڑ دیا تھا۔ وہ کراچی جہاں کی زندگی تجارت ہے، روپیہ ہے، درآمد و برآمد ہے۔ ہر شخص کی زبان پر روپیہ، روپیہ، روپیہ، روٹی، روٹی، روٹی ہے۔ موٹریں ہیں ٹرامیں ہیں، گدھے گاڑیاں ہیں، ہوائی جہازوں کا مرکز ہے۔ لوگ آتے ہیں لوگ جاتے ہیں۔ نوکری نہیں ملتی پیسہ نہیں ملتا روٹی نہیں ملتی تو کیماڑی میں جاکر ڈوب جاتے ہیں۔ کیماڑی جہاں پر سیٹھوں کے لئے خوشی کے پیغام آتے ہیں۔ سونا آتا ہے چاندی آتی ہے، تفریح گاہ اچھی ہے۔ کیماڑی غریبوں کے لئے بحرِ ظلمات ہے۔ وہ زندگی سے تنگ آکر گھوڑے دوڑاتے ہیں۔ جو آج تک زندگی کے اس کنارے تک نہ پہنچ سکے۔ بیچ میں نہ جانے کہاں غائب ہو گئے۔

کراچی میں کلفٹن ہے۔ کلفٹن میں موٹریں زیادہ جاتی ہیں جھلا جھل ساڑیاں نظر آتی ہیں۔ رنگ برنگے اسکرٹ نظر آتے ہیں۔ پنڈلیاں نظر آتی ہیں۔ عریاں باہیں نظر آتی ہیں۔ برقعے نقابیں، الٹے ہوئے برقعے نقابیں گرائے ہوئے۔ ہاتھی گھوڑا چھپے ہوئے کپڑے کے سوٹ پہنے مکرانی، کالی کالی ٹوپی کے گجراتی سیٹھ، سندھی پنجابی سب ہی

Marfat.com

نظر آتے ہیں۔

کلفٹن میں بیرونی ممالک کے سفارت خانوں پر جھنڈے لہراتے ہیں۔ دنیا کی پانچویں سب سے بڑی مملکت کی وزارت خارجہ[1] کا دفتر بھی وہی ہے۔ عبداللہ شاہ غازی کا مزار ہے۔ ہر جمعرات کو قوالی ہوتی ہے اور رنڈیوں کا چھما چھم ناچ بھی ہوتا ہے۔

میں تو کراچی سے تنگ آگیا تھا اور چاہتا تھا کہ اس گندی کثیف اور ہنگامی زندگی سے اگر کچھ عرصے کے لئے نجات مل جائے تو اچھا ہے۔

شام کو جب آفس سے گھر آیا تو مموبھیا کہنے لگے۔ کہ ہم پشاور وغیرہ کی سیر کو جا رہے ہیں تم بھی چلتے ہو؟ میں تو موقع کا منتظر ہی تھا۔ میرا ارادہ تھا کہ اگر کبھی موقع ملا تو پاکستان کی سیر ضرور کروں گا جب تک آزادی ہے بے فکری ہے شادی بیاہ کا چکر بھی نہیں ہے ایسے موقع سے ضرور فائدہ اٹھانا چاہیئے۔

بھیا نے ذرا منہ بسورا کیونکہ ان کی ملازمت پہلی تاریخ سے چلی گئی تھی جب کہ ہم آزاد تھے۔ ملک میں جمہوری راج قائم تھا ملازمت کی کوئی گارنٹی نہ تھی۔ بھلا ہو بھابی کا اس نازک وقت میں انھوں نے بڑی مدد فرمائی۔

"آپ تو چلے جایئے ایسے موقعے زندگی میں تھوڑے آتے ہیں اور پھر ابھی تو آپ آزاد ہیں۔ شادی بیاہ ہو جانے کے بعد پھر کون سیر کرتا ہے، گھر کے جھگڑے آدمی کو دیوانہ بنا دیتے ہیں ویسے

---

[1] وزارت خارجہ کا دفتر موہٹا پیلس میں تھا۔ اب اسلام آباد میں ہے۔

Marfat.com

بھی ہم لوگوں کی آمدنی قلیل ہوتی ہے۔ آپ تو اللہ کا نام لے کر چلے جائیے ان کی ملازمت چلی گئی تو کیا ہوا خدا مددگار ہے۔"

میں ننانوے روپے چودہ آنے کا کلرک تھا۔ سرسری طور پر خرچ کا اندازہ کیا دو سو روپے کا خرچ تھا۔ آج مہینے کی تیسری تاریخ تھی۔ تنخواہ پوری رکھی ہوئی تھی۔ صرف بیس روپے آفس میں کٹ گئے تھے جو میں نے سخت ضرورت کے تحت پیشگی لے لئے تھے۔ میں ایک مل میں ملازم تھا۔ اس ملازمت میں یہ آسانی تھی کہ ضرورت ہو تو پیشگی بھی روپے مل جاتے تھے۔ اس لئے سوچا پچاس روپے مالک سے لیے جائیں اور پچھتر روپے ڈاک خانے سے نکلوا لئے جائیں۔

صبح آفس جاتے ہی دوستوں سے کہا کہ افغانستان جا رہا ہوں، سب مذاق سمجھنے لگے میں نے ٹائپسٹ سے عرضی ٹائپ کروائی عرضی میں سیب لکھوایا کہ میرے بھائی کی شادی ہو رہی ہے۔ اس لئے پشاور جا رہا ہوں ایک ماہ کی رخصت منظور کی جائے۔ رخصت اور پچاس روپے منظور ہو گئے۔ روپے بھابھی کے پاس رکھا دیئے کہ جیب میں خط لکھوں تو لاہور روانہ کر دیجیے گا۔

میں تحقیقاتی دفتر اور ڈویژنل سپرنٹنڈنٹ کے آفس گیا کوئی صورت ایسی نکل آئے کہ ہم لوگوں کو سارے سفر کا پاس مل جائے اور جگہ جگہ ٹکٹ نہ خریدنا پڑے مگر یہ کوشش بے کار رہی۔

سامان درست کیا سری جانے کا ارادہ تھا۔ اس لیے گرم کپڑے

Marfat.com

بھی رکھے بازار میں بستر بند کی قیمت پوچھی تیس روپے پینتیس روپے اوپر کا سانس اوپر اور نیچے کا نیچے اٹک گیا۔ بھلا ہم کلرک لوگ کیا سیاحت کر سکیں گے۔ بھیا کا بستر بند اور کیمرہ لیا تھیلے میں روزانہ کی ضروریات کی چیزیں رکھیں ممو بھیا دری میں لپٹا ہوا بستر اور ایک بکس لئے ہوئے آئے۔

ہم کراچی چھوڑ رہے تھے۔

اُردو کا پہلا ریلوے ٹائم ٹیبل " اوقات نامہ " خریدا۔ گرمی اور دھوپ بہت تیز تھی۔ دور دور تک بنجر اور چونے کے پتھر کی پہاڑیاں نظر آتی تھیں۔ جنگ شاہی پر پلا مچھلی خریدی پلا مچھلی سندھ کا خاص کھانا ہے۔ مچھلی تلی ہوئی تھی۔ سندھی مچھلی کے کچھ سے صاف نہیں کرتے اس لئے ہمیں بھی کچھ سمیت کھانا پڑی۔

جنگ شاہی ٹھٹھہ کا اسٹیشن ہے۔ ٹھٹھہ ہم دونوں پہلے بھی دیکھ چکے تھے لہٰذا یہ جگہ پروگرام سے خارج تھی۔ ممو بھیا کی رائے تھی کہ پہلے حیدرآباد چلا جائے وہاں سے زیر تعمیر کوٹری بند دیکھنے چلیں پھر حیدرآباد واپس آکر موہن جوڈارو دیکھنے چلا جائے ممو بھیا نے مجھے لیڈر بنا دیا تھا اور کہہ دیا تھا کہ تم لیڈر ہم تمہارے پیچھے پیچھے جہاں جاؤ گے چلیں گے جو کھلاؤ گے کھائیں گے۔ چاہے چنے ہی کیوں نہ کھلاؤ۔ اس لئے ٹکٹ میں نے خریدا جو ڈوکری (موہن جوڈارو) کا تھا اور ہم سیدھے ڈوکری جا رہے تھے۔

Marfat.com

مچھلی کھانے سے ممّو بھیا مزدل میں آگئے۔ جھم پیر پر کہنے لگے "یار کباب لے لو"

ان کے کباب کے مطالبہ پر میں نے کہا "ابھی گھر سے کھانا کھا کر چلے ہیں۔ پلا مچھلی کھائی ہے اب کباب کا ارادہ ہے"

مگر ممّو بھیا کب ماننے والے تھے "ہم تو کھائیں گے" کباب لینے پڑے کوٹری ہرا نگور لیے میں نل پر دھونے گیا۔ سوال درپیش تھا۔ کہ دھو کر کس چیز میں رکھے جائیں میں نے شرارت سے کہا نکالیے اپنا رومال !!

"یار رومال خراب ہو جائے گا۔

"پھر میں کیا کروں کاہے میں رکھوں ؟؟

اچھا یار لو !!

ممو بھیا نے اپنا سفید رومال نکال کر پھیلا دیا،

گاڑی کوٹری سے روانہ ہو چکی تھی اور دریائے سندھ کے کنارے جا رہی تھی۔ سامنے کوٹری کا پل تھا۔ دریا طغیانی پر تھا۔ اس لئے پانی کناروں سے نکل کر چار۔ چار۔ چھ چھ میل پھیلا ہوا تھا۔ لائین کے دونوں طرف پانی ہی پانی نظر آتا تھا۔ گاڑی اس مقام پر پہنچی جہاں دریائے سندھ پر نیا بیراج تعمیر ہوا ہے اور جو کوٹری بیراج کے نام سے مشہور ہے۔ میں سنگ بنیاد رکھے سے پہلے وہ مقام دیکھ آیا تھا اور راستے میں اتنی گر دلی تھی کہ

Marfat.com

ایک جگہ ڈرائیور سے کہتا پڑا جیپ کو روکو ؟ کہیں ایسا نہ ہو کہ ہم گڑھے میں گر پڑیں ،، اور ہوا بھی ایسا ہی اگر ڈرائیور جیپ نہ روک لیتا تو واقعی ہم سب گڑھے میں جا گرتے کیوں کہ گرد کی وجہ سے ہمیں کچھ سجھائی نہیں دیتا تھا۔

ہمارے سامنے ایک بہت بڑا کھدائی کا انجن نہر کھود رہا تھا اور مٹی کھود کھود کر دونوں کناروں پر ڈال رہا تھا اور ایک انجن مٹی برابر کر کے کنارے بنا رہا تھا۔ دور کچھ کرینیں دریا کے کنارے کام کر رہی تھیں میں ممّو بھیا کو بتا رہا تھا۔ وہ ورکشاپ ہے وہ دیکھئے وہ جو کرین نظر آ رہی ہے۔ بس اُسی جگہ سنگ بنیاد رکھا گیا ہے وہ آفس ہے۔ اور وہ مزدوروں کے جھونپڑے ہیں ،،

اب ہمارے ایک طرف ببولوں کا جنگل تھا۔ دوسری طرف چٹیل میدان اور کہیں کہیں چونے کے پتھر کی پہاڑیاں جنگل نہایت گھنا تھا اور سارے جنگل میں پانی ہی پانی نظر آتا تھا۔ بات یہ ہے کہ دریائے سندھ کے کناروں سے پانی نکل کر دور تک پھیل جاتا ہے جس کی وجہ سے جنگل پیدا ہو جاتے ہیں زیادہ تر جنگل تھور بنا (جھاؤ) اور ببول کے ہیں۔

ہم دریائے سندھ کے مغربی کنارے پر جا رہے تھے کم آباد ہونے کی وجہ سے اکثر اسٹیشن بنا کر اجاڑ دیئے گئے تھے ہمیں ایسے اجڑے ہوئے کئی اسٹیشن ملے۔

Marfat.com

شام ہو چکی تھی سامنے کوہ کرتھر کے پیچھے۔ دور آفتاب غروب ہو رہا تھا۔ جنگل لائین کے دونوں طرف تھا۔ اور گاڑی نہایت تیزی سے منزل کی جانب پہاڑوں میں دندناتی ہوئی داخل ہو گئی کوہ کرتھر ہمالیہ ہی کے سلسلے ہیں۔ یہ پہاڑ بہت نرم پتھر کے ہیں ان کو بھی چونے کا یا ریت کا پتھر کہنا چاہیئے دھوپ سے پگھلے ہوئے پہاڑ ہیں کہیں کہیں پہاڑ پھسل گئے ہیں پھر دھوپ سے تڑخ گئے ہیں اور درازیں سی بن گئی ہیں یہاں دریائے سندھ پہاڑ سے ٹکراتا ہے۔ ریلوے لائین پہاڑ کی کمر سے لپٹی، بل کھاتی سرنگوں میں سے ہوتی ہوئی جاتی ہے ایک طرف دریا ہے دوسری طرف اونچے اونچے پہاڑ ہیں۔ منظر بڑا ہیبت ناک اور دلچسپ ہے پہاڑوں سے نکلنے کے بعد گاڑی ایک چھوٹے سے اسٹیشن پر رُکی یہ سندھیوں کا قبیلہ گاہ سہون تھا۔ یہاں سال میں ایک دفعہ بہت بڑا میلہ لگتا ہے۔ کہتے ہیں کہ یہاں پیران پیر کے نواسے دفن ہیں۔ ان کے علاوہ ایک اور کوئی بزرگ ہیں جن کا مزار بنا ہوا ہے۔ ہیں اسٹیشن پر اترا ایک فقیر نے جو لوبان سلگاتے ہاتھ میں چمٹا لیئے سر پر کشمیری ہاتوؤں کے مانند سُرخ ٹوپی پہنے جس میں سلمہ ستارے کا کام ہو رہا تھا۔ چمٹا بجاتے ہوئے لوبان ہمارے سامنے کر دیا" دو خدا کے نام پہ بڑے پیر صاحب کی نیاز"

جس طرح اپنے دفتر کی کھڑکی پر کھڑے ہوئے فقیروں کو

---

ع۱ اس وقت مجھے یہی بتایا گیا تھا اور مجھے سہون کے بارے میں زیادہ معلومات بھی نہ تھیں۔

Marfat.com

دن میں نہ جانے کتنی بار سلام کرتا ہوں؛ اسی طرح میں نے سلام کو ہاتھ اٹھایا۔ بابا۔ معاف کرو" اور آگے بڑھ گیا۔ ایک صاحب سے پوچھا مزار اور زیارت گاہ کتنی دور ہے۔ انہوں نے ہاتھ کے اشارے سے بتایا وہ روشنی نظر آرہی ہے یہاں سے دو میل دور بکے جاتے ہیں،، مجھے اندھیرے میں کچھ نظر نہ آیا اور گاڑی چل دی دادو میں ہم نے کھانا کھایا مچھلی کی تلاش تھی مگر نہ ملی مجبوراً مرچوں بھرے کباب کھائے منہ جل کر کباب ہو گیا۔

رات کو ایک بجے ڈوکری پہنچے پلیٹ فارم کے دوسری طرف اترے کیونکہ پلیٹ فارم پر دوسری گاڑی کھڑی تھی جب گاڑیاں چلی گئیں تو پلیٹ فارم پر آئے گرمی کے مارے بُرا حال تھا گرمی حبس۔ ہلکا ابر۔ سندھ میں بادلوں سے کبھی غلطی نہیں ہوتی اس لئے بارش کا کوئی امکان نہ تھا۔

میں پہلے بھی یہاں آچکا تھا صرف موہنجوڈارو کی وجہ سے آیا تھا پہلے جب آیا تھا تو سردی کی وجہ سے بڑا حال تھا اور اندھیرے میں کچھ نظر نہیں آتا تھا۔ اب کی گرمی تھی۔ چاندنی رات ہلکا ہلکا ابر، حبس اور مچھر! پلیٹ فارم پر بستر کھول کر لیٹ گئے۔ بدقسمتی سے میں نیکر پہنے تھا۔ رات بھر مچھروں نے خوب میزبانی کی کاٹ کاٹ کر موٹے موٹے ددوڑے ڈال دیئے عجب کش مکش تھی اگر چادر اوڑھتا تو گرمی لگتی چادر ہٹا دیتا تو مچھروں کی فوج حملہ آور ہوتی ڈوکری

87309

کا چھوٹا سا اسٹیشن تھا چاروں طرف جنگل پھر انجان علاقہ۔ طرح طرح کے خیالات آتے تھے۔

رات بڑی تکلیف میں گذری۔ صبح ضروریات سے فارغ ہوئے اسٹیشن کے دوسری طرف سامنے دادو کنال بہہ رہی تھی اور کہیں بلندی پر سے پانی گرنے کی آوازیں آرہی تھیں سندھ میں جگہ جگہ ہینڈ پمپ اور ٹیوب ویل لگا دیئے ہیں۔ ہم لوگوں نے منہ ہاتھ دھوئے اور تانگوں کا انتظار کرنے لگے۔

ہمیں اسٹیشن سے نو میل دور موہن جوڈارو دیکھنے جانا تھا کچھ دور تو راستہ اچھا بنا تھا۔ اس کے بعد کچی سڑک تھی گرمی بھی سخت تھی۔ تانگے والے نے دس روپے مانگے ہم راضی ہوگئے ہمیں تو جانا تھا چاہے وہ دس کے بیس ہی کیوں نہ لیتا حالانکہ جب میں پچھلی دفعہ آیا تھا تو اسی یک چشم تانگے والے نے مجھ سے چھ روپے لیے تھے۔ بس تنہا تھا راستے بھر میں نے اسے موٹی موٹی بیڑیاں پلائی تھیں۔ جو مجھے حیدرآباد میں چھوٹے خاں نے دی تھیں۔ میں پان بیڑی سگرٹ کا عادی نہیں مگر تحفہ سمجھ کر رکھ لی تھیں۔

پہلے ہم قصبے میں گئے جو اسٹیشن سے دو میل کے فاصلے پر تھا۔ وہاں ہوٹل میں سامان رکھا اور ناشتہ کیا سندھ میں کہیں بھی جائیے ہوٹل ملیں گے۔ قصبے میں چھوٹا سا بازار اسکول اور



Marfat.com

ہاسپٹل بھی تھا۔ تحصیل دار کا دفتر اور گورنمنٹ زراعتی فارم بھی تھا یہ فارم میرا دیکھا ہوا تھا۔ سندھ میں گھوم پھر کر یہ احساس ہوتا ہے کہ سندھ جدید ترقی یافتہ صوبہ ہے۔ موجودہ دور کی ترقیات کے اکثر بیشتر سامان یہاں موجود ہیں۔

قصبے سے نکل کر ہم دھان کے کھیتوں سے نکل رہے تھے دونوں طرف ہرے ہرے دھان کے کھیت لہلہا رہے تھے۔ کہیں کسان ہل چلا رہے تھے اور کہیں دھان لگا رہے تھے۔ ان میں عورتیں، بچے بوڑھے نوجوان سب ہی تھے۔ سندھی کسان۔! نہایت غریب کالے کالے، بڑے بڑے بال چھدری داڑھی، داڑھی کم و بیش سب رکھتے ہیں۔ عورتیں پردہ نہیں کرتیں، کسان۔ جاہل اور تعلیم سے ناآشنا ہیں اسی لئے انتہائی سادگی سے مات کھائے ہوئے ہیں۔ سندھ میں بڑے بڑے وڈیروں، جاگیرداروں اور زمینداروں کی حکومت ہے

ہم نے بازار سے امرود خرید لئے تھے۔ میں کاٹ کاٹ کر تقسیم کر رہا تھا۔ میں نے تانگے والے سے پوچھا "ہم جیسے کتنے آدمی روز آتے ہیں"؟!

بک چشم تانگے والے نے جس نے دھوپ کی عینک پہنی ہوئی تھی اور کچھ UPTO DATE اپ ٹو ڈیٹ معلوم ہوتا تھا۔ جواب دیا "کوئی کوئی دن آتا ہے اور کوئی دن نہیں آتا کوئی دن بہت آتا ہے اور کوئی دن ایک بھی نہیں آتا ایک ہفتہ ہوا تین چار تانگہ

Marfat.com

بھر کر گیا تھا۔ گرمی کی وجہ سے ایک گھوڑا بھی مر گیا۔ گرمی بہت ہے اس لئے بہت کم آتا ہے۔"

گرمی اور دھوپ بہت تیز تھی۔ تانگے پر چھت بھی نہیں تھی۔ ہم کیھورینا کے گھنے جنگل میں سے گذر رہے تھے۔ کہیں کہیں سندھی ہاتھوں میں کلہاڑیاں اور تبر لئے ہوئے گھوم رہے تھے باللہ خیر، میں نے دل میں کہا مگر ڈرنے کی کوئی وجہ نہ تھی جب تانگہ ان کے قریب سے گذرتا تو وہ جھک کر ہمیں سلام کرتے کیونکہ ہماری وضع قطع وڈیروں کی مانند تھی اور وڈیرے ان کے مجازی خدا تھے۔ ہم ایسی جگہ پہنچے جہاں دریائے سندھ کے پانی کو روکنے کے لئے پشتہ باندھا گیا تھا۔ ہماری سمت بدل گئی ابتک ہم دریا کی جانب جا رہے تھے۔ اور اب منزل کی جانب بڑھنے لگے۔

# موہن جوڈارو

لو صاحب! جو اونچا اونچا زمین ہے۔ وہ "موہن جوڈارو" ہے تانگے والا بولا یہاں ایک نالے کا پُل تھا۔ یہ نالا سرخ مٹی کے ٹیلوں سے بہتا آ رہا تھا۔ یہی ٹیلے موہن جوڈارو تھے۔ گذشتہ مرتبہ جب میں آیا تھا تو اسی نالے کے پل پر اسی تانگے والے نے ایک ادھورا قصہ سنایا تھا، کہنے لگا۔

"یہ سُرنگ جو اب نالا بن گیا ہے۔ ڈرے سے دریا کو جاتا ہے۔ اس میں ڈرے کے راجہ کی لڑکی اپنے عاشق سوہنے

Marfat.com

جاتا تھا۔ جو دھوبی تھا۔ میں نے پر معنی ہوں، کیا یہ سسی پنوں کی لافانی کہانی کا کھوج تھا۔ سسی پنوں سندھ کے لیلےٰ مجنوں، شیریں فرہاد، ہیر رانجھا۔

ہمارا تانگہ ٹیلوں میں داخل ہو گیا، زمین میں ایک تختی لگی تھی جس میں انگریزی میں "MOEN-JO-DARO" تحریر تھا۔ ہم ڈاک بنگلے میں پہنچے۔ یہاں میوزیم بنا تھا۔ پنجابی سپرنٹنڈنٹ صاحب نے ہمارا استقبال کیا پوچھنے لگے کہاں سے تشریف لائے ہیں؟

"کراچی سے"

"صرف اسی مقصد کے لئے"

"جی ہاں آگے بھی جانے کا ارادہ ہے۔ پشاور تک!" ہم نے کہا "آپ قابل دید مقامات SITES وغیرہ دیکھ لیجئے کیونکہ دھوپ تیز ہو جائے گی بعد میں میوزیم دیکھ لیجئے گا میں آدمی ساتھ کئے دیتا ہوں۔ وہ خاص خاص مقامات دکھائے گا۔" ایک سندھی کو آواز دینے لگے۔ یٰسین خان او یٰسین خان!! یٰسین خان آئے جو اچھی خاصی کام چلاؤ اردو بولتے تھے۔

ہم یٰسین خان کے ساتھ ہو لئے انہوں نے ہمیں بڑا حمام دکھایا بادشاہی محل اور بدھوں کا استوپ بھی دکھایا استوپ پر کھڑے ہو کر دیکھا، سامنے دریائے سندھ بہہ رہا تھا۔ ظالم دریا!! کتنی مرتبہ اس مرکز تہذیب و تمدن کو برباد کر چکا تھا۔ اب

Marfat.com

اکثر جگہ جہاں سے پانی آنے کا خطرہ تھا۔ پشتے باندھ دیئے گئے ہیں وہ جگہ بھی دیکھی جو قیام پاکستان کے وقت کھودی گئی تھی وہاں اب پانی بھرا ہوا تھا۔

"صاب ہم نے سکھر سے پانی نکالنے کا انجن منگایا مگر پانی کسی طرح کم نہیں ہوتا تھا۔ اس لئے کھدائی بند کر دی۔ یٰسین خان بولے

یہ کیا جگہ تھی یہاں سے کچھ چیزیں بھی ملیں؟؟ میں نے پوچھا

خیال ہے کہ یہ غلے کا گودام تھا اس کی چیزیں لاہور بھیجی گئی ہیں صاف ہو رہی ہیں۔

حمام کے چاروں طرف چھوٹی چھوٹی کوٹھریاں بنی تھیں جن میں کپڑے بدلتے ہوں گے۔ اس کے علاوہ حمام کے چاروں طرف پختہ نالیاں بنی ہوئی تھیں۔ ایسی نالیاں موہن جوڈارو میں سڑکوں گلیوں اور مکانوں میں باقاعدہ طور سے بنی ہوئی ملتی ہیں۔ حمام سے پانی نکالنے والی نالی میں بھی گئے۔ جو ایک سرنگ کی طرح تھی اور ایک آدمی باآسانی گذر سکتا ہے۔ دیوار میں دونوں طرف سوراخ تھے خیال کیا جاتا ہے کہ ان سوراخوں میں تختے پھنسا کر پانی کو کم یا زیادہ کرتے ہونگے

استوپ کے چاروں طرف سانچی (وسط ہند) کی طرح بھکشوؤں کے رہنے کی کوٹھریاں بنی ہیں۔ استوپ کا اوپری حصہ چکنی مٹی کا ہے جو اب گر چکا ہے یہ جگہ سب سے اونچی ہے اور بدھوں کے زمانے میں تعمیر ہوئی تھی۔

Marfat.com

یہاں سے منظر بہت اچھا دکھائی دیتا ہے ایک طرف دریائے سندھ ۔ حد نگاہ تک پانی اور جنگل ۔ چاروں طرف جنگل ۔ قریب میں سارا شہر ۔ اُجاڑ ۔ ٹوٹا پھوٹا ۔ ویران ۔

یہاں سے اتر کر ہم دوسری جگہ دیکھنے گئے یہاں یٰسین خان نے ہمیں اُسی زمانے کا پلاسٹر دکھایا جو جالی لگا کر محفوظ کر دیا گیا تھا جس طرح آج کل بھی دیہاتوں میں مکانوں کو مٹی یا گھریا لیپنے سے تہہ پر تہہ جم جاتی ہے ۔ اسی طرح یہاں بھی تہہ پر تہہ پرت پر پرت جمے ہوئے دیکھائی دیتے ہیں ۔

ہم نے کیا ترقی کی ؟ ماقبل تاریخ بھی ہم اپنے گھروں کو مٹی اور گھریا سے لیپتے تھے ۔ وہ لوگ سڑکوں اور گلیوں سے گندہ پانی نکالنے کے لئے نالیاں بناتے تھے ۔

جہاں نالیاں نہ تھیں وہ گندہ پانی جمع کرنے کے لئے حوض بنا دیتے تھے کہیں کہیں سقاوے بھی نظر آئے سارے شہر میں جگہ جگہ کنویں بنے ہیں ۔ کہیں پر تو کنویں کے چاروں طرف کی مٹی پانی سے بہہ گئی مگر کنواں سالم و ثابت کھڑا ہے ۔ ایک ایک کنویں سے کئی کئی کنوؤں کی تعمیر کے آثار اوپر نیچے ملتے ہیں ۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ایک شہر اجڑا کنواں بھی اُجڑ گیا دوسرا شہر اجڑے ہوئے شہر کی بنیاد پر بنا دیا گیا ۔

سڑکیں سیدھی اور کشادہ بنی ہیں ، اکثر مکانوں میں بڑے بڑے

Marfat.com

ہال اور کمرے معلوم ہوتے ہیں مگر ساتھ ہی چھوٹی چھوٹی کوٹھریاں بھی ملتی ہیں۔ جن میں راستے بھی نہیں ہیں۔ ہم لوگ کہیں کہیں راستوں پر اور کہیں دیواروں پر چلتے تھے۔ شہر کے باہر ایک بڑی چوڑی سڑک ہے جو شاہراہ اعظم کہلاتی ہے۔ اس سڑک کے دوسری طرف شہر پناہ کی دیوار بھی ہے۔ یہاں ایک طرف سے آواز آرہی تھی۔ ایک چرواہا گا رہا تھا۔

جیا بے قرار ہے چھائی بہار ہے
آجا میرے بالما تیرا انتظار ہے

یہ فلمیات یہاں بھی پہنچ گئیں چرواہا تین ہزار سال قبل کی مردہ روحوں کو اس جادو سے جگا رہا تھا۔ جھنجھوڑ رہا تھا۔ مگر روحیں تھک ہار کر اپنا کام ختم کر کے چین کی نیند سو گئی تھیں اور اپنے آثار ہمیں بھٹکانے کے لئے چھوڑ گئی تھیں۔

مارشل کا خیال ہے۔ کہ یہ کھنڈرات پانچ ہزار سال پرانے ہیں مگر اب وھیلر کہتا ہے کہ نہیں! تین ہزار سال پرانے ہیں بڑے بڑے دماغ جو چاہتے ہیں۔ قیاس کر کے لکھ ڈالتے ہیں اور ہم بڑی متانت سے اور سنجیدگی کے ساتھ ان کی اس تحقیق پر ایمان لے آتے ہیں۔

ہم میوزیم آئے سپرنٹنڈنٹ صاحب سے کچھ سوال کر ڈالے
ممو بھیا نے پوچھا کھنڈرات کتنے پرانے ہیں؟ ،، مارشل کا خیال

Marfat.com

ہے کہ پانچ ہزار سال مگر اب وصیلر کہتا ہے کہ تین ہزار سال پرانے ہیں،، ور بولے

ممتو بھیا نے کہا،، وصیلر نے کیا کمال کر دیا دو ہزار سال کم بتا دیئے ،،

میں نے پوچھا،، میرا تو خیال ہے یہ شہر نہیں ہے بلکہ کسی راجہ کا محل ہے۔ کیونکہ مکانوں کی انفرادیت کا کہیں احساس نہیں ہوتا سب ایک دوسرے سے ملے ہوئے ہیں۔

،، نہیں صاحب یہ پورا شہر ہے اگر آپ فسادات کے بعد کا لاہور دیکھتے خصوصاً شاہ عالمی تو ایسا نہ کہتے جب تباہی آتی ہے تو مکانوں کے ساتھ ایسا ہی ہوتا ہے۔ سب ایک دوسرے میں گڈ مڈ ہو کر مل جاتے ہیں اور تمیز مشکل ہو جاتی ہے کہ کونسا مکان کہاں تھا؟

ہم نے دو دو آنے کے ٹکٹ لئے اور میوزیم دیکھنے چلے گئے سخت گرمی اور ہوا آنے کا راستہ بھی بند تھا۔

مٹی کے بڑے بڑے ماٹ اور ان کو رکھنے کے چبوترے مٹی کے برتن۔ رکابیاں۔ گلاس گلدستوں کے اسٹینڈ اور ڈھکنے، مٹی کی انگیٹھی کھلونے وغیرہ۔ پتھر کے اوزار چاقو ہلوں کے پھل۔ قیمتی پتھروں کے ہار اور زیورات۔ سونار اور لوہار وغیرہ کے اوزار تانبے کی سوئیاں مچھلی پکڑنے کے کانٹے۔ مٹی کے شطرنج یا چوسر کے مہرے ان سب

Marfat.com

چیزوں کی تفصیل نہیں لکھی جا سکتی مگر ان کو دیکھنے سے ایک بات معلوم ہوتی ہے۔ وہ لوگ بڑے صانع کاریگر اور ہوشیار تھے مٹی کے اکثر کھلونے نہایت خوبصورت اور بڑے کمال کے بنائے ہیں جانوروں پر اُن کے جذبات یعنی اگر غصے میں ہیں تو بڑی خوبی سے ان کا غصہ اس کے منہ پر جھلکتا دیکھایا ہے۔

بہت سی چیزوں کو دیکھ کر معلوم ہوتا ہے۔ کہ ان کا تعلق قدیم مصریوں سے بھی رہا ہو گا ان کے دیوتا بھی تھے۔ وہ لوگ پڑھے لکھے بھی تھے اور مہریں استعمال کرتے تھے۔ جن پر جانوروں کی تصویریں ہوتی تھیں۔ جانوروں میں بیل کو بڑی اہمیت حاصل تھی۔ جو لفظ مہروں میں تحریر تھے وہ سمجھ سے بالاتر تھے۔

ہم باہر آئے پی ڈبلیو ڈی کے ملازم ایک سندھی بیٹھے تھے علیک سلیک ہوئی بڑے دلچسپ آدمی تھے تو تکار سے بات کر رہے تھے "تو کہاں ملازم ہے"!

"میں تو پی ڈبلیو ڈی میں ملازم ہوں اور یہ ایک پرائیویٹ کمپنی میں ملازم ہے" ممتو بھیا نے ہنس کر کہا۔

"آپ سیک صاحب کو جانتے ہیں؟"

"جی ہاں وہ تو ہمارے آفیسر ہیں۔"

"ابکی ہم کراچی گئے گا ہم کو ضرور ملنا۔"

پنجابی سپرنٹنڈنٹ صاحب اور ایک سندھی صاحب ایک

Marfat.com

خط ٹائپ کرنے لگے۔ جس کے مضمون سے معلوم ہوتا تھا کہ یہاں فرسٹ کلاس کے مسافروں کے لئے ایک بہت اعلیٰ درجہ کا بنگلہ بنانے کی اسکیم ہے۔

تھرڈ کلاس کو کون پوچھے؟ مجھے اپنی فکر ہوئی۔

ہم اجازت لے کر رخصت ہوئے اور ایک بجے واپس آ گئے ہوٹل کیا تھا۔ اچھا خاصا نگار خانہ تھا۔ مصطفےٰ کمال تولیوں کے سامنے ننگی تلوار ہاتھ میں لئے کھڑے ہیں۔ کہیں انور بے مونچھوں کو تاؤ دیئے تلوار کمر سے باندھے گھوڑے پر بیٹھے میدان جنگ میں سپاہیوں کو لڑا رہے ہیں۔ قائداعظم گھوڑے پر سوار عربی لباس پہنے ننگی شمشیر ہاتھ میں لئے جھنڈا اڑا رہے ہیں۔ پشت پر ایک مسجد بنی ہے ایک طرف جاپانی آرٹ کی ننگی ننگی تصویریں لگی تھیں۔ ایک جاپانی عورت ساق سیمیں عریاں کئے بڑے انداز سے بال بنا رہی ہے نہایت باریک لباس پہنے ایک دوسری تصویر میں ایک جاپانی عورت جھولے پر جھولا جھول رہی ہے باریک لباس ہوا میں اڑ رہا ہے مس کجن مادھوری، نسیم۔ ممتاز شانتی، بیگم پارن، منور سلطانہ، لیلا چٹنس سب دیواروں پر چسپاں ہو کر رہ گئی تھیں۔

ہم نے کھانا منگایا تنوری روٹی مرچوں بھرا گوشت کسی صورت سی سی کر کے کھایا کھانے کے بعد دو گلاس گلاب کے شربت کا آرڈر دے دیا۔ یہ جیسے گلاب نہ تھا۔ گلابی تھی میں پیتا جاتا تھا اور

Marfat.com

کراچی کے ماحول کو کوستا جاتا تھا۔

کراچی ــ جہاں میں مل کے آفس میں بیٹھا ہوتا ہوں میرے سامنے سے ہر تھوڑی دیر کے بعد ٹرام گھڑ گھڑ کرتی ہوئی گذرتی ہے موٹریں گذرتی ہیں، آدمی گذرتے ہیں۔ عورتیں گذرتی ہیں چوکیدار کبھی کبھی آپس میں باتیں کرنے لگتے ہیں۔ کبھی مجھے بھی شامل کیا جاتا ہے

دیکھا بابو جی ! ــ کیا برقعہ ہے ! ۔ کیا چال ہے ! "قلندر شاہ" ان باتوں میں سب سے زیادہ تیز ہے ہمری گلی آنا ــ ! ! اچھا جی "! پھر میری طرف پکار کر، بابو ــ ! ہوں ! ہوں !"

"سیٹھ خدا کی راہ پر دے ؟ ؟ اللہ تیرا بھلا کرے ــ ! تیری ترقی کرے۔

میں بغیر دیکھے مستحق ہے یا غیر مستحق۔ سلام کو ہاتھ اٹھاتا ہوں فقیر چلا جاتا ہے۔ لنگڑے لولے اپاہج ہٹے کٹے بوڑھے جوان عورت مرد بچے میں سب کو سلام کرتا ہوں۔ حالانکہ لفظ سیٹھ میرے لئے گالی ہے۔

میں بابو ہوں ۔ میں کلرک ہوں ۔ میں سیٹھ ہوں کراچی میں کلرک بھی سیٹھ بن جاتا ہے اور ــ اور اب میں بھی سیٹھ بن گیا ہوں پانچ بجے گھر روانہ ہو جاتا ہوں، سیکنڈ ہینڈ سائیکل ہے راستے میں پنکچر ہو جاتا ہے ۔ میں چونک پڑا ! گلاس ختم ہو گیا تھا۔

Marfat.com

گرمی اور دھوپ میں اسٹیشن روانہ ہوئے نٹڈیرو کے ٹکٹ لئے نٹڈیرو میں ہمارے ایک عزیز رہتے تھے۔ ہم نے سوچا رات گھر میں گذارنا چاہیئے کیونکہ جو گاڑی ہمیں مل رہی تھی وہ جیکب آباد جاتی تھی اور ہمیں سکھر جانا تھا۔ نٹڈیرو ڈوکری سے چار اسٹیشن اور لاڑکانہ سے دو اسٹیشن کے فاصلے پر ہے۔

ایک آنہ اسکریم ایک آنہ اسکریم یہ لاڑکانہ تھا۔ ہم بڑی بے صبری سے اسکریم پر ٹوٹ پڑے یہ اسکریم نہ تھی۔ بلکہ آئس فروٹ یا "چسکی" تھی۔

## نٹڈیرو

نٹڈیرو میں ہم بن بلائے مہمان بن کر پہنچے مگر جس طرح مہمان کا استقبال ہوتا ہے۔ ناخواندہ ہی کیوں نہ سہی ہمارا بھی ہوا پنکھا لاؤ، کپڑے تبدیل کر لیجیئے۔ گرمی بہت ہے۔ کیوں آنا ہوا؟ کہاں جائیے گا۔

ہم کنوئیں پر جا کر خوب نہائے کنواں قریب ہی کسی تارک وطن کے گھر میں تھا۔ گھر میں ایک مندر بھی تھا۔ نٹڈیرو میں کافی تعداد میں غیر مسلم ہیں، بڑی آزادی سے رہتے ہیں تجارت اور کاروبار کرتے ہیں۔ مہاجرین سے تعلقات اچھے ہیں۔ مندر میں پوجا ہوتی تھی۔ میں نے ڈرتے ڈرتے مندر کے دروازے کو کھول کر اندر

Marfat.com

جھانکا پیپل کا ایک ناگ کنڈلی مارے بیٹھا تھا۔ سنگ مرمر کی کچھ مورتیاں اِدھر اُدھر رکھی تھیں۔ ہیں نے دروازہ اسی طرح بند کر دیا جیسا تھا۔ معلوم ہوا یہ عورتوں کا مندر ہے۔ اس میں عورتیں پوجا کرنے آتی ہیں اُس وقت معلوم نہیں تھا کہ عورتیں ناگ کی پوجا کیوں کرتی ہیں۔ بعد میں معلوم ہوا کہ ناگ ہندو دیومالا میں جنس کی علامت ہے۔

شام کو ہم قصبے کی سیر کو نکلے ہم نہر پر ٹہلتے ہوئے گئے۔ نہر جاری تھی۔ نہر کے دور دیہ کھجور کے درخت لگے تھے۔ کھجور کے خوشوں میں چٹائیاں لپیٹ دی گئی تھیں۔ تاکہ کھجور پکنے پر ضائع نہ ہو جائیں۔ ہم خان بہادر کے باغ میں گئے۔ کافی بڑا سلیقہ سے لگا ہوا باغ تھا۔ یہ خان بہادر وڈیرے۔ زمیندار جاگیردار یہاں کے حاکم ہیں۔ لاڑکانہ سے ایک وڈیرے صاحب ہمارے ساتھ تھرڈ کلاس میں سوار ہو گئے۔ انہیں بھی نندیرو جانا تھا۔ کہیں شامت کے مارے ان کے "ہاری" (کسان) بھی اس ڈبے میں بیٹھے تھے۔ انہیں دیکھتے ہی کھڑے ہو گئے جھک کر سلام کیا اور ان کے پیر چومے "سائیں راضی خوشی؟ بھلو؟ چنگو؟"

بازار گرمی اور دھوپ کی وجہ سے ٹاٹ اور چٹائیوں سے ڈھکا ہوا تھا۔ آم کافی میٹھے اور رسیلے کھائے رات کافی گرمی اور درجہ حرارت بڑھ جانے کی وجہ سے طوفان باد آگیا بڑی کڑک چمک کالی گھٹا تھی پھر بھی پانی سے محرومی رہی۔

گاڑی میں ڈیڑھ گھنٹے کی تاخیر تھی۔ بڑا انتظار کرنا پڑا آج

Marfat.com

کوئی بانسری بجانے والا بھی نہ تھا۔ پہلے جب میں آیا تھا تو ایک سندھی کسان بانسری بجا رہا تھا۔ کہنے لگا، سائیں ۔ یہ بھیرویں ہے ''۔ ایک عجیب دل کشی تھی ۔ آج بھی اس کا لطف کانوں کو محسوس ہوتا ہے۔ ہم تمہارے ملک کا گانا بجاتا ہے۔

ساون کے بادلو ۔ یہ اُن سے جا کہو!

اس بیچارے کو کیا معلوم ہے کہ یہ کس ملک کا گانا ہے اور کون گاتا ہے۔ فلمی گانوں نے بھی لوک گیتوں پر اپنا اثر جمانا شروع کر دیا اور بڑی تیزی سے دیہاتوں میں فلمی گانے اور طرزیں پھیلتی جا رہی ہیں کہیں یہ فلمی گانے اور طرزیں لوک گیتوں کو بالکل ختم نہ کر دیں جس طرح آج کل کلاسیکل موسیقی کی عوام میں کوئی وقعت نہیں اگر ایسا ہو گیا تو یہ بڑا نقصان ہو گا۔ لوک گیت ہی عوام کے ترجمان ہیں۔ ان کی روح ان میں گھلی ہوتی ہے۔

---

ان کی زندگی ان کا رہن سہن ان کا تمدن ان کی تہذیب و معاشرت ان گیتوں میں رچی بسی ہوتی ہے۔ یہی ان کی زندگی کے صحیح آئینہ دار ہوتے ہیں۔

وہی کیھور ینا کے جنگل میں ہماری گاڑی جا رہی تھی جس میں پانی بھرا ہوا تھا۔ رک (RUK) سے آگے سکھر بند کے مغربی کنارے سے نکلنے والی تینوں نہریں ملیں۔

ہر نہر پر اس کے نام کی تختی لگی تھی۔

Marfat.com

۱۔ نہر دادو DADU CANAL

۲۔ دھان کی نہر RICE CANAL

۳۔ شمالی مغربی نہر NORTH WESTERN CANAL

اگلا اسٹیشن حبیب کوٹ تھا۔ چھوٹا سا اسٹیشن بالکل نئی طرز کا بنا ہوا تھا۔ میں تفریحاً اوور برج پر چلا گیا ایک اسٹیشن کے ملازم سندھی سے ملاقات ہوئی پانی کی شکایت کرنے لگے

"پانی کی بڑی تکلیف ہے رُک سے ٹینکوں میں بھر کر لاتے ہیں"

"ریلوے ٹیوب ویل کیوں نہیں لگاتی؟" میں نے پوچھا۔

"پانی کھاری نکلتا ہے"

مجھے حیرت ہوئی کہ دریائے سندھ اتنا قریب ہے پھر بھی پانی کھاری ہے؟؟

Marfat.com

# سکھر

سامنے لینس ڈاؤن پل کے اونچے اونچے اسپان نظر آرہے تھے۔ سکھر قریب آرہا تھا۔ یہ جے۔ پی منگھارام بسکٹ فیکٹری تھی۔ اب سیٹھ محمد یعقوب اینڈ سنز ہوگئی ہے۔ سامنے پہاڑی پر کسی پیر کا مزار تھا۔ ایک مہاجر شاید ہمیں اونچے طبقے کا نمائندہ سمجھ کر دل کے پھپھولے پھوڑنے لگا "بڑی بڑی کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ فیکٹریاں الاٹ کرالیں۔ ہم سے کہا اسلامی حکومت قائم کریں گے۔ ایسی ہوتی ہے اسلامی حکومت؟؟ یہ کیا ہے؟؟" ہم پینٹ، ہیٹ اور دھوپ کی عینکیں پہنے ہوئے تھے۔ اس لیے غلط فہمی ہوگئی تھی۔

ہوٹل میں سامان رکھا اور میر معصوم کے منار پر چڑھ گئے۔ میر معصوم اکبر کے زمانے میں سندھ کے گورنر تھے۔ مینار کے نیچے ان کی اور ان کی اولاد کی قبریں بنی ہوئی ہیں۔ ہم مینار پر چڑھ گئے۔

یہاں دریائے سندھ چونے کے پتھر کی پہاڑیوں کے درمیان نہایت تنگ گذرگاہ سے نکلتا ہے اور جس جگہ لینس ڈاؤن پل بنا ہوا ہے۔ وہاں بکھر کا جزیرہ ہے قلعے کے آثار ابھی تک باقی ہیں۔ حالاں کہ پورا قلعہ کھنڈرات میں تبدیل ہو چکا ہے دریا شہر کے مشرق میں بہتا ہے

Marfat.com

ہم یہاں سے تمام شہر سکھر بیراج، لینس ڈاؤن پل۔ ریڑی اور دور دور تک کا منظر دیکھ رہے تھے۔ اتنے اونچے مینار پر ہوتے ہوئے بھی ہوا بہت کم لگ رہی تھی۔ گرمی اور حبس تھا۔ اس لئے مینار سے نیچے اترنے کو جی نہیں چاہتا تھا۔ کافی دیر تک اوپر مینار پر بیٹھے رہے۔

دہلی ہوٹل، میں کھانا کھایا۔ کھانا مزیدار تھا کھانے میں سندھ کا مشہور سنگھاڑا، مچھلی بھی کھائی کھانے کے بعد ہم لینس ڈاؤن پل دیکھنے چلدیئے۔ " یہ صرافہ بازار ہے۔ یہ فریر روڈ ہے، یہ بندر روڈ ہے"، تانگے والا ہمیں بتا رہا تھا۔

ہم نے ایک ایک پیسے کا ٹال ٹکس ٹکٹ لیا اور لینس ڈاؤن پل میں داخل ہو گئے۔ یہ پل ایسی جگہ بنا ہے جہاں دریا دو چٹانوں کے درمیان بہتا ہے بیچ میں بکھر کا جزیرہ ہے سکھر کی طرف کا حصہ عام پلوں کی طرح ہے۔ یعنی نیچے ایک ستون بھی ہے پل کے اندر جانے کے دروازے نارمن اسٹائل کے ہیں اور بکھر کے جزیرے میں کھنڈروں پر بارکیں بنائی گئی ہیں جن میں پل کی حفاظت کے لئے فوج رہتی ہے۔ ریڑی سے سکھر اور کوٹہ جانیوالی ریل کی لائین انہیں کھنڈروں پر سے گذری ہے۔ جزیرے سے گذر کر پل کے دوسرے حصے میں داخل ہوئے یہ حصہ حیرت انگیز طریقے کا بنا ہوا ہے۔ یہی حصہ جھولتا پل (HANGING BRIDGE) کہلاتا ہے۔

پہلے بھی حیران رہ گیا تھا اور اس دن بھی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ کہ اتنا بڑا اور وزنی پل بغیر کھمبوں کے کس طرح قائم ہے؟ آج بھی

Marfat.com

دم بخود تھا۔ پل کو دیکھتے ہی احساس ہوتا ہے کہ پل کی تعمیر میں لوہے کا اسراف کیا گیا ہے۔ کیونکہ بہت اونچے اونچے لوہے کے گارڈر کھڑے کئے گئے ہیں۔ کچھ گارڈر آڑھے ترچھے ہیں، کچھ ادھر ادھر گئے ہیں۔ کچھ اوپر گئے ہیں۔ پھر سب مل کر ایک کنارے پر زمین میں گاڑ دیئے گئے ہیں۔ اسی طرح دوسری طرف بھی ہے پل میں کھمبا کہیں نہیں ہے، پل توازن پر قائم ہے۔

ممو بھیا نے مجھے بہت سمجھانے کی کوشش کی، میری سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ میں نے زندگی میں اور اس سفر میں ایسی حیرت انگیز محیر العقول چیز نہیں دیکھی۔

کہتے ہیں جب پل سے ریل گاڑی گذرتی ہے تو پل جھومے کی طرح ہلتا ہے۔ ہمارے سامنے ایک گاڑی گذری مگر پل ٹس سے مس نہ ہوا اور جنبش بھی نہ کھائی۔ کوڑی کا پل جو کھمبوں پر قائم ہے۔ جب ریل گذرتی ہے۔ تو اس میں کافی لچک پیدا ہوتی ہے، اس میں لچک تک پیدا نہ ہوئی۔

یہ پل صرف ریل اور مسافروں کے لیے بنا ہے موٹریں گاڑیاں وغیرہ بیراج کے ساتھ والے پل پر سے جاتی ہے۔

گذشتہ مرتبہ میں رہڑی کی طرف کنارے تک گیا تھا اور کشتی میں سکھر واپس ہوا تھا۔ جب کشتی پل کے نیچے سے گذری تو ایک سندھی جو دلچسپ معلوم ہوتے تھے، ہنس کر بڑے فخریہ انداز میں کہنے لگے

"دیکھا آپنے؟ — یہ پل سندھیوں نے بنایا ہے"

---

لہ اب ریل گاڑی گزرنے کے لئے ایک دوسرا پل "ایوب برج" تقریباً اسی طرح کا بنایا گیا ہے اور لینس ڈاؤن پل پر سڑک بنا کر پل عام ٹریفک کے لئے کھول دیا گیا ہے۔

Marfat.com

میں نے بھی ہنس کر اُسی انداز میں جواب دیا وہ جی ہاں ہے! ضرور بنایا ہوگا۔ انگریز نے اینٹیں اور گارا اٹھا کر دیا ہوگا''۔!!

ہم سکھر کی طرف آئے اور تانگہ کر کے سکھر بیراج دیکھنے چل دیئے بکھر کے جزیرے کے علاوہ وہاں ایک جزیرہ اور تھا جو سادھ بیلا کہلاتا تھا اس جزیرے میں غیر مسلموں کے مندر بنے تھے جو اب حکومت کے انتظام میں تھے اور بغیر اجازت اندر جانا منع تھے۔

ہم بندر روڈ پر جارہے تھے۔ بندر روڈ دریا کے کنارے کنارے گئی ہے۔ دریا کی طرف پتھروں کا پشتہ بنا ہوا ہے، ورنہ شہر میں پانی آجانے کا خطرہ ہے سڑک نہایت خستہ حالت میں پڑی ہے اگر درست کر دی جائے تو سکھر کی بہترین سیرگاہ ہو سکتی ہے بلحاظ مناظر سندھ میں سکھر سب سے بہتر جگہ ہے۔

ہم سرکٹ ہاؤس کے قریب سے گذرے، ہاؤس میں پہرہ لگا تھا اور سڑک پر بہت سے دیہاتی جمع تھے۔ تانگہ والا کہنے لگا وہ دو لڑکے ٹھہرے ہوئے ہیں۔ معلوم نہیں کون ہیں؟۔

یہ حروں کے پیر، پیر پگاڑ کے لڑکے تھے۔ اپنی والدہ سے ملنے انگلینڈ سے آئے تھے۔ انگریزوں نے ان کے والد کو شہید کر دیا تھا۔ وہ سچ مچ حروں اور آزادی کے پیر تھے۔

ہم بیراج کے پشتے پر چڑھ رہے تھے۔ ترتیب وار شمالی مغربی نہر دھاق کی نہر۔ اور نہر دادو اس جگہ سے نکالی گئی ہیں۔ جس طرح بیراج[۱] میں لوہے کے پھاٹک لگے ہیں اور پھاٹکوں کو اوپر نیچے کرنے کا

---

[۱]۔ بیراج (BARRAGE) ایک ایسا پل ہوتا ہے جس میں لوہے کے پھاٹک لگا دیئے جائے جو کھولے اور بند کئے جا سکتے ہیں۔

Marfat.com

بنک جاتی تھیں۔ اس در میں پانی نہیں تھا۔ بلکہ دیوار ہونے کی وجہ سے (جس کا میں تذکرہ کر چکا ہوں) ریت جمع ہو کر ایک جزیرہ بن گیا تھا۔ ہم لوگ نیچے اتر گئے یہاں کچھ مہاجر کسان سائے میں آرام کر رہے تھے وہ لوگ رات میں بھی اسی جگہ رہتے تھے، ان کے پاس ہل بیل اور چارپائیاں بھی تھیں معلوم ہوا حکومت نے اس جزیرہ کی زمین ایک سال کی مدت کے لیے ان کسانوں کو دی ہے اور یہ لوگ اس زمین میں دو ہفتہ سے محنت کر رہے ہیں مگر ابھی تک یہ زمین قابل کاشت نہیں ہو سکی ہے۔ کیونکہ دریائی گھاس جو فصل کے لیے نقصان دہ ہے اندر تک جڑ پکڑے ہوئے ہے۔ ہم کسانوں سے باتیں کرنے لگے۔

ان میں سے ایک پوچھنے لگا "صاحب! کیا ایسے ہی حالات رہیں گے جیسے اب ہیں"؟

"کیا ہندوستان واپس جانا چاہتے ہو"؟ میں نے پوچھا۔

"نہیں صاحب! اب نہیں۔ کرنال میں اللہ کا دیا سب کچھ تھا۔ زمین تھی، گھر بار تھا۔ سال ہا سال سے رہتے آئے تھے جانا پہچانا تھا۔ مگر قسمت نے سب کچھ چھڑا دیا۔ اب تو در بدر کی ٹھوکریں کھانا لکھی ہیں"

ہم دریا میں نہانے لگے پانی کافی تیز بہہ رہا تھا۔ بہاؤ کی وجہ سے پیروں کے نیچے سے زمین کھسکی جاتی تھی۔ سامنے ایک بہت بڑی کشتی تیار ہی تھی، جس کو چپوؤں سے چلا کر دھارے میں چھوڑ دیا تھا اور بادبان تان دیئے تھے۔ کشتی بڑی تیزی سے دھارے پر بہی چلی جا رہی تھی ہمارے

Marfat.com

جو طریقہ ہے وہی ان ہنروں کے سروں (HEADS) پر بھی ہے
بیراج کے چیف انجینئر کا دفتر بیراج ہی پر بنا ہے۔ ممو تھیا کا ارادہ ہوا کہ
بیراج کے بالائی حصے پر چلا جائے۔ اوپر جانے کے لیے انجینئر سے
اجازت لینا پڑتی تھی۔ اور انجینئر دوپہر کا کھانا کھانے گیا ہوا تھا
میں گذشتہ مرتبہ اوپر چڑھ کر دیکھ آیا تھا۔ وہاں پھاٹکوں کو اٹھانے
بٹھانے کے لئے بجلی سے چلنے والی مشینیں لگی تھیں اور ایک ریل کی
لائین پڑی تھی جس پر دو کرینیں چلتی تھیں۔ یہ کرینیں ان درختوں کو
نکالنے کے لیئے ہیں۔ جو دریا میں بہہ کر آجاتے ہیں اور بیراج میں
آکر اٹک جاتے ہیں۔

لوہے کے بڑے بڑے مضبوط پھاٹک ہر در میں لگے ہیں
یہ پھاٹک تاروں کے رسوں کی مدد سے لٹکے ہوئے ہیں اور اوپر
کی بجلی کی مشین کے ذریعے اٹھائے بٹھلائے جاتے ہیں۔ بیراج پورا
ایک میل لمبا ہے۔ چھیاسٹھ در ہیں دریا کے چڑھاؤ کی طرف جہاں
سے نہریں نکالی گئی ہیں۔ دونوں کناروں سے کچھ فاصلے پر دیواریں
بنادی ہیں یہ دیواریں، کیچڑ، ریت وغیرہ کو نہروں میں جانے سے روک
دیتی ہیں۔ بیراج کے ساتھ پل بھی بنا ہوا ہے بیراج بھی ایک قسم کا پل ہی ہے
فرق یہ ہے کہ بیراج کے در کھولے اور بند کیئے جا سکتے ہیں۔ پل کے
نہیں۔

ہم ایک ایسے در میں پہنچے جہاں لوہے کی سیڑھیاں نیچے پانی

Marfat.com

دیکھتے دیکھتے نظروں سے اوجھل ہو گئی، دریائے سندھ جب طغیانی پر بڑھتا ہے اور پانی کناروں سے نکل کر دور، دور پھیل جاتا ہے تمام دیہاتی راستے پانی کی وجہ سے بند ہو جاتے ہیں تو پھر یہی کشتیاں ہیں جن سے دیہاتوں میں آمد و رفت جاری رہتی ہے۔

ہم نہانے کے بعد اوپر پل پر آئے اور دوسرے کنارے پر پہنچے، اس کنارے پر بیراج کا عجائب گھر بنا تھا۔ ایک سندھی، نہایت شریف اور خلیق ملے یہ بیراج کے ملازم تھے اور انہوں نے بذات خود بیراج کی تعمیر میں بحیثیت ایک مزدور کے کام کیا تھا۔ انہوں نے کہا وہ آپ عجائب خانہ بھی دیکھئے، پھر آپ ہی آپ پکے ہوئے پھوڑے کی طرح پھوٹ پڑے "یہ دیسی صاحب لوگ ـــ اب تو کسی کی سنتے ہی نہیں ان سے اچھے تو پہلے والے تھے۔ یہ تو سمجھتے ہیں بس ـــ اپنی حکومت ہے ـــ خوب موج کرو۔ مزے اڑاؤ !! میں نے اپنی جان خطرے میں ڈال کر کام کیا۔ ایک مرتبہ پھسل کر گر پڑا تھا۔ بڑی مشکل سے جان بچی تھی۔ پہلے والے صاحب لوگوں نے لکھ کر اوپر بھیجا کہ ترقی دی جائے ـــ آج تیس برس ہو گئے ہیں۔ ابھی تک کوئی نتیجہ نہیں نکلا ـــ آئیے میں آپ کو عجائب خانہ دکھواتا ہوں"

عجیب بات ہے ـــ مہاجر کسان کو اچھی زمین نہیں ملتی۔ محنت کئے جاتا ہے روپیہ لگاتا ہے ـــ مگر نتیجہ صفر۔ !! سندھی تو مہاجر نہیں ـــ ؟ پھر بھی تکلیف میں ہے ـــ پیٹ کا سوال ہے خون پسینہ

Marfat.com

ہاکر پھر ڈھوتا ہے۔ بیراج بناتا ہے۔ کبھی پھسل کر گر پڑتا ہے۔ بڑی مشکل سے جان بچتی ہے۔ ساری عمر ملازمت میں صرف کر دیتا ہے پھر بھی ترقی نہیں ہوتی؟ ہم سندھی صاحب کے ساتھ عجائب خانہ کے ملازم سے ملے ان کی سفارش سے وقت نہ ہوتے ہوئے بھی ملازم نے عجائب خانہ کھول دیا۔ سندھی صاحب ہمارے ساتھ تھے۔ ہم تصاویر۔ ماڈل۔ نقشے دیکھتے رہے ایک تصویر کو دیکھ کر سندھی صاحب کہنے لگے "دیکھئے۔ یہ میں ہوں اور یہ انجینئر صاحب ہے"

"ہاں۔ وہی داڑھی، وہی مونچھیں۔ ہاتھ میں ہتھوڑا لئے کھڑے تھے۔

ہم عجائب گھر سے باہر آئے انہیں کچھ دینا چاہا مگر انہوں نے لینے سے انکار کر دیا۔ ان کے اس انکار میں ایک طرح کا درد تھا۔ دکھ تھا اپنوں کی سرد مہری تھی۔ بے اعتنائی تھی۔ کیا معلوم کیا ہر سندھی اسی طرح پکے ہوئے ناسور کی طرح ہے؟؟ جس کو جب بھی ذرا چھیڑا۔ اور وہ پھوٹ بہا۔؟؟ سندھی۔ کالی شلوار لال پگڑی والا۔ بھدری داڑھی مونچھوں والا۔ کالی رنگت بڑی بڑی سرخ آنکھوں والا دن بھر سندھ کی چلچلاتی ہوئی دھوپ میں ہل چلانے والا، وڈیرے کو دیکھ کر پیر چومنے والا۔ ایک پکا ہوا پھوڑا ہے۔ اس کو جب چاہو چھیڑ دو۔ وہ پھوٹ کر بہہ جائے گا۔ کیا معلوم ورکبھی ایسا بھی ہو کہ سیلاب آجائے جس میں ہزاروں موہنجوداڑو بہہ جائیں کون جانے یہ کب ہوگا۔؟؟

ہم مشرقی کنارے کی نہریں دیکھ رہے تھے۔

Marfat.com

(۱) KHAIRPURE FEEDER WEST خیر پور مغربی نہر

(۲) ROHRI CANAL روہڑی کی نہر۔

(۳) KHAIRPURE FEEDER EAST خیر پور مشرقی نہر

(۴) NARA CANAL. نارا نہر

نارا نہر ببرے گاؤں کی ندی سے دوگنی چوڑی تھی اور بڑی تیزی سے بہہ رہی تھی۔ نقشہ دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ نہر ایک چھوٹی سی ندی ہی تھی۔ جس کو اب نہر کی شکل دے دی گئی ہے ہم نے تانگے والے سے سندھی کھجوریں خرید کر کھائیں کافی نرم اور میٹھی تھیں تانگہ میں سوار ہوئے اور پل پار ہوتے ہوئے پھر اسی کنارے پر آ گئے۔ تانگے والے سے کہا تانگے کو سیراج کی بستی میں سے لے کر چلو۔ کافی لمبی چوڑی با ترتیب بستی تھی اور سیراج کے عملے کے لیے مخصوص تھی۔

ہم گھنٹہ گھر پر تانگے سے اتر گئے سینما دیکھنے کا ارادہ ہوا۔ ایک معمولی سے کھیل کے ساتھ زندہ ناچ گانا بھی تھا۔ کھیل شروع ہونے میں کافی وقت تھا۔ ہم نے آم خریدے اور ایک ہوٹل میں بیٹھ گئے۔ بہت دنوں کے بعد اچھے آم کھانے کو ملے تھے۔ آم کھا کر لسی پی اور سینما پہنچ گئے۔ کھیل اچھا تھا۔ اگر یہ بیہودہ ناچ شامل نہ ہوتا۔

پوڈر اور لپ اسٹک تھپے چہرے۔ موٹی اور بھدی چڑیلیں موٹے موٹے کولھے مٹکا مٹکا کر تھرک رہی تھیں نہ ناچ میں آہنگ

Marfat.com

نہ ساز ہیں زیر و بم ـــ بے تکا ـــ بے مطلب۔ محض ناچ ـــ بے سُرا گاتا۔

یہ توہین تھی ـــ آرٹ کی توہین! کلا کی توہین ـــ! فن کی توہین ـــ ببل چودھری۔ رام گوپال کی توہین ـــ اور سب سے بڑھ کر اودے شنکر کی توہین! اُمالا اودے شنکر کی توہین!، لوک ناچ، فیکٹری اور مزدور، فیکٹری اور کسان۔ ناگا ناچ، مُنی پوری ناچ، کتھا کلی ناچ، گوجری کا ناچ، راجپوتانہ کے کسانوں کا ناچ، پنجابی ناچ، خٹک ناچ ایک ایک کر کے میری آنکھوں کے سامنے ناچنے لگے۔

یہ اودے شنکر کی "کلپنا" تھی جو پیٹ کی بھوک، مجبوری، لاچاری بے کسی اور غربت بن کر آج سینما کے اسٹیج پر ناچ رہی تھی۔ اور یہاں تک ناچی ـــ ناچتے۔ ناچتے فقروں پر بھی اُتر آئی۔ چھ آنے والے جو زیادہ شور مچا رہے تھے اور کبھی کبھی فقرے بھی چست کر دیتے تھے ان کے فقروں کے برابر کے جواب دیئے جا رہی تھی۔ کھیل ختم ہوا ہم باہر نکلے۔ ہمیں ریڑی کی گاڑی لینا تھی۔

ہوٹل آکر سامان لیا۔ تانگہ کیا۔ تانگے والا ہمیں دھوکا دے گیا کہنے لگا جس گاڑی میں آپ جانا چاہتے ہیں وہ تو چلی گئی۔ میں ابھی ابھی اسی گاڑی کی سواریاں لے کر آیا ہوں،،

---

ملاحظہ "کلپنا" نام کی ہندوستان کے مشہور رقاص اودے شنکر اور اس کی بیوی اُمالا نے ایک ڈاکومنٹری فلم بنائی ہے اس میں غیر منقسم ہندوستان کے تمام رقص یکجا کر دیئے ہیں۔

Marfat.com

"بھیر"

"ایسا ہو سکتا ہے کہ آپ رہڑی پل (ریبنس ڈراؤل پل) تک تانگے میں چلے جائیے۔ وہاں سے مزدور مل جائے گا جو آپ کو رہڑی اسٹیشن تک چھوڑ آئے گا۔ پل سے اسٹیشن دو میل ہو گا"

ہم پل پر آئے، پل کے نیچے ہی تھے کہ وہی گاڑی جسے ہیں لینا تھا۔ پل پر گھڑگھڑاتی ہوئی ہمارے سامنے سے چلی جا رہی تھی۔ میرا غصّے کے مارے بُرا حال تھا۔ جی چاہ رہا تھا کہ تانگے والے کو خوب ستاؤں۔ میں نے بڑی نا امیدی اور حسرت سے کہا "تم تو کہتے تھے کہ گاڑی چلی گئی۔ پھر یہ کون سی گاڑی تھی؟۔؟"

"یہ دوسری گاڑی ہے صاحب!!"

"اماں ہٹو"! اس میں نے جھلا کر کہا "بلاؤ مزدور کو"

بڑی آوازیں دینے کے بعد ایک دبلا پتلا لڑکا آیا۔ میں نے پوچھا "تم اتنا سامان اٹھا لوگے؟ اور اسٹیشن تک لے چلو گے؟؟"

"ہاں صاحب! کوشش تو کروں گا۔!"

یہ نہیں ہو سکتا۔ بلاؤ کسی بڑے کو۔ میں عذاب نہیں لینا چاہتا"

تھوڑی دیر کے بعد ایک جوان مزدور مل گیا۔ ہم پل پر روانہ ہوئے بڑا ہیبت ناک منظر تھا۔ لوہے کے بڑے بڑے اونچے اونچے گارڈر دیوؤں کی طرح معلوم ہو رہے تھے۔ پل کے نیچے پانی،

Marfat.com

شور مچاتا، چٹانوں سے ٹکراتا بہہ رہا تھا۔ سامنے بیراج پر بجلی کے قمقمے بڑے خوبصورت معلوم ہو رہے تھے۔ ان کا عکس پانی پر ناچ رہا تھا۔

ہم پل عبور کر کے چونے کے پتھر کی پہاڑیوں میں ریلوے لائین کے ساتھ ساتھ جا رہے تھے پہاڑیوں کو کاٹ کر لائینیں نکالی تھی۔ پہاڑیاں زیادہ اونچی نہ تھیں مگر اندھیری رات ہونے کی وجہ سے ڈراؤنی معلوم ہو رہی تھیں۔ دو میل پیدل چلنے کے بعد ہم لائینیں پھاندتے سگنل کے تاروں سے الجھتے اسٹیشن کی جگمگاتی ہوئی روشنی میں تھے۔

گاڑی رات کے ایک بجے آتی تھی۔ اس لیے بستر کھول کر لیٹ گئے۔ ہماری اگلی منزل بہاولپور تھی۔ میں بہاولپور ٹھہرنے کا مخالف تھا اور ممو بھیا کی رائے تھی کہ بہاولپور بھی دیکھا جائے وہ کہنے لگے "وہاں بہاولپور کا لج ہے۔ نواب صاحب کے محلات ہیں" میں ریاستوں کے حالات سے اچھی طرح واقف تھا میرے لیے بہاولپور میں کوئی کشش نہ تھی۔ اس لیے میں نے کوشش کی کہ ممو بھیا کو بہاولپور ٹھہرنے سے باز رکھوں اس کے علاوہ میں لیڈر بھی تھا اور میری رائے مقدم تھی۔ بہر حال ممو بھیا کے اصرار پر بہاولپور کے ٹکٹ خریدے۔

ہم چناب ایکسپریس میں روانہ ہوئے، میں بہاولپور نہ ٹھہرنے کی ترکیب سوچ رہا تھا۔ اتفاق سے میرے پاس ایک نوجوان

Marfat.com

بیٹھے تھے باتوں سے معلوم ہوا وہ بہاولپور جا رہے ہیں اور وہیں ملازم ہیں، میں نے ان سے پوچھا "کیوں صاحب! وہاں کیا کیا چیزیں قابلِ دید ہیں"؟؟

"کچھ بھی نہیں" وہ ہنستے ہوئے بولے۔

میں نے ممو بھیا سے کہا "ذرا ان صاحب سے پوچھئے یہ کیا کہتے ہیں"

انہوں نے ممو بھیا کو وہاں کے بارے میں بہت سی باتیں بتائیں اور یہی مشورہ دیا کہ ہم وہاں نہ ٹھہریں تو اچھا ہے۔ لہٰذا بہاولپور پروگرام سے خارج ہو گیا۔ اب مجھے ٹکٹ ملتان تک بڑھوانا تھا۔

بہاولپور دن نکلے آیا۔ چھوٹا سا اسٹیشن تھا اسٹیشن کی عمارت عجیب تھی، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ قمقمے یا بڑے بڑے پیالے اوندھا دیئے گئے ہیں۔ اسٹیشن پر پولیس کے سپاہی پھر رہے تھے۔ جن کی وردیاں ہرے رنگ کی تھیں۔ ٹرکش کیپ بھی ہری تھی۔ یہاں اخبار ملنے کی کیا امید ہو سکتی تھی میں نے اِدھر اُدھر اخبار والے کو تلاش کیا مگر کوسوں پتہ نہ تھا۔ دریائے ستلج عبور کرنے کے بعد لودھراں آیا۔ ناشتہ کیا۔ اخبار خریدا اور ٹکٹ بھی ملتان تک کا بتوا لیا۔

اب ہم پنجاب کے جنوبی علاقے سے گذر رہے تھے ریلوے لائن کے دونوں طرف ریت کے تودے تھے کہیں کہیں انہیں

Marfat.com

تو دوں میں سے ہروں جارہی تھیں ۔ ایک جگہ تارکول کی سڑک نظر آئی میں سمجھا ملتان آرہا ہے میں نے ہیٹ لگایا اور خیال نہ رہا کہ ہوا بہت تیز ہے جوں ہی کھڑکی سے سر نکالا ۔

”میرا ہیٹ“ !

میرا ہیٹ میرے سر سے غائب تھا اور ہوا میں لہراتا بل کھاتا لڑھکتا چلا جارہا تھا ۔ میں اپنے نقصان پر ماتم نہیں کرتا ۔ افسوس نہیں کرتا غم نہیں کھاتا ۔ دوسروں پر اظہار نہیں ہونے دیتا ۔ بار بار تذکرہ نہیں کرتا ، کیونکہ میرا عقیدہ ہے ۔ جو چیز ضائع ہوگئی وہ ہوگئی اب واپس نہیں آسکتی مگر آج دل مسوس کر رہ گیا تھا ۔ لوگوں نے قہقہے بلند کئے

”صاحب کا ہیٹ گر گیا ہے“

”صاحب کتنے کا تھا ہیٹ ؟ ؟ بڑا اچھا تھا ہی ہی ہی !!“

”مجھے بڑا افسوس ہے“

افسوس آپ کو خاک ہے ؟ آپ کو کیا افسوس ! دس روپئے کا میرا ہیٹ ! کراچی کی دھوپ گرمی اور طپش میں یہ ہیٹ کام دیتا تھا اور پورے سفر میں کام لیتا تھا ۔ کہیں کہیں رعب بھی جماتا تھا ۔ میں ہیٹ کھو کر ایک شکست خوردہ کیطرح گھائل اپنی سیٹ پر ملتان کے انتظار میں بیٹھا تھا ۔ اسٹیشن آیا گاڑی کی رفتار کم نہ ہوئی یہ مظفر گڑھ تھا ۔ ملتان ابھی بہت دور تھا ۔

Marfat.com

# ستلج پار

## ملتان

ملتان پر گاڑی رکی، میں قلی کو سامان دینے لگا، ہندوستانی پھر دیہاتی ۔ ! مسافر اترنے بھی نہ تھے۔ کہ گھسنا شروع ہو گئے۔ ایک طوفان بے تمیزی، ہلڑ، دھکم دھکا، ریل پیل۔ شور۔ غل غپاڑا۔ ایک پر ایک لدا جا رہا تھا۔ اس ہلڑ بازی میں میرا تھیلا کہیں سامان کے نیچے دب گیا۔ ممو بھیا پلیٹ فارم پر کھڑے کمر پر ہاتھ رکھے اسٹیشن پر ملتانی نقاشی کا معائنہ کر رہے تھے۔ میرا دم گھٹا جا رہا تھا۔ پسینے میں شرابور اس غل و شور میں چلا رہا تھا "ارے ہٹو۔! یہاں میرا تھیلا ہے! مجھے تھیلا نکال لینے دو ۔ !" مگر کون سنتا ہے؟؟

تھیلے میں روزانہ کی ضروریات کے علاوہ ایک بٹری اور دیوان غالب بھی تھا۔ دیوان غالب میں پچیس ۲۵ روپئے اس لئے رکھ دیئے تھے۔ کہ اگر کوئی شاطر گرہ کٹ اپنے ہاتھ کی صفائی دکھائے تو یہ روپئے کام دیں۔ گاڑی چلنے میں بہت کم وقت رہ گیا تھا اور میں گلا پھاڑ کر چلا رہا تھا۔ آخر ایک صاحب ذرا کھسکے تو ان کے نیچے سے تھیلا نکلا۔ میں تھیلا لے کر بھاگا اور پلیٹ فارم پر کھڑے ہو کر لمبی لمبی سانسیں بھرنے لگا۔ غصے میں ممو بھیا کو بھی سنا ڈالیں ممو بھیا میں لاکھ روپئے

Marfat.com

کی ایک بات ہے۔ وہ کبھی خفا نہیں ہوتے۔ تانگے والے سے کہا ہمیں ہوٹل لے چلو۔ وہ ہمیں چھاؤنی کی طرف لے جانے لگا۔ جہاں بڑے بڑے ہوٹل تھے۔

میں نے پوچھا "کہاں چل رہے ہو؟"

"صاحب لوگوں کے ہوٹل میں" ۔۔!

"ارے۔ ہم صاحب لوگ نہیں ہے تم تو اپنے ہندوستانی ہوٹل میں لے چلو" اس نے تانگہ موڑ لیا۔ تھوڑی دور چلنے کے بعد ایک ہوٹل میں ہم اُتر گئے ہوٹل میں خوب نہلئے۔ کھانا کھایا۔

ہوٹل کا بیرا ایک لڑکا سا تھا اردو اچھی بولتا تھا۔ ہم پر اپنی برتری جتانے لگا کہنے لگا "یہاں کوئی بیرے کا کام نہیں جانتا یہ کام میں کراچی سے سیکھ کر آیا ہوں جس چیز کی ضرورت ہو مجھے پکار لیجئے گا۔"

تھوڑی دیر بعد ایک بڑے میاں بغل میں ایک موٹا سا رجسٹر دابے ہوئے آئے کہنے لگے "صاحب! نام پتہ وغیرہ لکھا دیجئے اور دستخط کر دیجئے۔"

مجھے بڑا غصہ آیا میں نے غصے میں کہا "یہ کیوں؟ یہ کیا بے تمیزی ہے؛ کیا ہم چور اُچکے۔ بدمعاش۔ لچے۔ لفنگے ہیں؟؟"

بڑے میاں سٹپٹائے کہنے لگے "صاحب ہم کیا کریں پولس والے کہتے ہیں" ممو بھیا نے خانہ پری کر کے دستخط کر دیئے۔

چار بجے ہم نے تانگہ کیا اور شہر دیکھنے روانہ ہوئے۔ کہتے ہیں ملتان

Marfat.com

مقبروں کا شہر ہے، ہمیں تو بہت زیادہ مقبرے نہیں دکھائی دیئے ملتان سے زیادہ مقبرے تو ٹھٹھہ میں ہیں۔ جو چار پانچ میل کے رقبے میں پھیلے ہوئے ہیں۔ ان میں سے ہم صرف آدھے دیکھ سکے تھے۔

یہاں ہم نے صرف تین چار مشہور مقبرے دیکھے۔ ہم شہر میں سے گذر کر قدیم شہر کی شہر پناہ کے نیچے نیچے جا رہے تھے۔ ہم جس سڑک پر جا رہے تھے۔ وہ قدیم شہر کے چاروں طرف بنی تھی۔ شہر پناہ جگہ جگہ سے ٹوٹ کر گر چکی ہے کہیں کہیں مرمت بھی کر دی گئی ہے۔ مگر زیادہ حصہ نہایت شکستہ حالت میں ہے اندرون شہر میں زیادہ آبادی غیر مسلموں کی تھی۔ جو اب خالی ہو چکی ہے ہم شہر کا چکر لگا کر دوسری طرف نکل گئے ہم شمس تبریز کا مزار دیکھتے جا رہے تھے۔ اتفاق سے تین دن سے یہاں میلہ لگا ہوا تھا اور آج میلے کا آخری دن تھا۔

تانگے والے نے ہجوم سے بچا کر ایک جگہ تانگہ کھڑا کیا اور خود رہنما کے فرائض انجام دیتا ہوا ہمیں مزار دکھاتے لے چلا۔

مزار کا گنبد سبز رنگ کا ہے اور طرز تعمیر کے اعتبار سے ٹھٹھہ کے مزاروں سے ملتا جلتا ہے اس کے علاوہ جو نقاشی کی گئی ہے۔ وہ ہم ٹھٹھہ میں دیکھ چکے تھے۔ دروازے پر جوتے اتار کر ہم صحن میں داخل ہوئے یہاں محفل قوالی جمی ہوئی تھی۔ قوال، نغمہ، بجا رہے تھے چاروں طرف پنجاب کے دیہاتی اور کسان بڑی عقیدت کے ساتھ بیٹھے ہوئے تھے ہم صفوں کو چیرتے پھاندتے خاص مزار میں پہنچے۔ نہایت تنگ و

Marfat.com

تاریک گنبد کے اندر ہاروں پھولوں سے لدی ہوئی ایک قبر بنی ہوئی تھی ۔ قبر کے اوپر جھالر لٹکی تھی اور سرہانے لوبان سُلگ رہا تھا لوبان کی بُو سے میرا سر پھٹنے لگا ۔ گرمی تھی اور ہوا کا کہیں گذر نہ تھا ۔ عقیدتمندوں کا ہجوم تھا ۔ عقیدت مند آتے تھے قبر پر پھول چڑھاتے قبر کو ہاتھ لگا کر چومتے پھر دہی ہاتھ آنکھوں میں ملتے ۔ کافی دیر منہ ہی منہ میں فاتحہ پڑھتے ۔ پھر اُلٹے پاؤں واپس ہو جاتے ۔ ہمارا تانگے والا بھی پرانے عقیدت مندوں میں سے تھا ۔ اس نے بھی یہی عمل شروع کر دیا ۔ ہم نے قبر کو چاروں طرف سے گھوم پھر کر دیکھا اور باہر آ گئے ۔

باہر کی گیلری میں بھی چکر لگایا ۔ پیچھے کیطرف ۔ سب سے الگ ایک نہایت حسین و جمیل دوشیزہ بُرقع پہنے نقاب اٹھائے ایک ادھیڑ عمر کے شاہ صاحب کے پاس بیٹھی تھی اور شاہ صاحب اُس کا ہاتھ ملاحظہ فرما رہے تھے ۔ ہمیں دیکھا تو حضرت جھجکے ۔ معلوم نہیں کیا معاملہ تھا؟ ۔

ہم پھر صفوں کو چیرتے پھلانگتے اپنے گائیڈ کے ساتھ باہر نکلے ۔ "یہ شمس بابا بڑے پہنچے ہوئے پیر ہیں" تانگے والا ایک تاریخ داں کیطرح لیکچر دے رہا تھا ۔ ان کے زمانے میں آفتاب سوا نیزے پر رہتا تھا ۔ اسی لئے شمس بابا کہلاتے ہیں ۔ بابا آفتاب میں مچھلیاں بھون بھون کر کھاتے تھے" کبھی ہیں اور کبھی مو بھیاد ہوں ۔ ہاں، کر دیتے تھے وہ اپنا لیکچر ایک فاضل پروفیسر کیطرح دیئے جا رہا تھا، ملتان کا

Marfat.com

تاریخ دان جو ٹھہرا۔ واقعی لاہور کے میوزیم میں شمس بابا آفتاب میں مچھلیاں بھون بھون کر کھا رہے تھے۔

میلے میں سب دیہاتی ہی دیہاتی نظر آتے تھے۔ تھیٹر اور ڈرامے کا بھی انتظام تھا۔ ایک طرف ڈھول پیٹا جا رہا تھا۔ چرخ چوں کے جھولے میں لوگ جھول رہے تھے ساس اپنی بہو کو لائی تھی "چل شمس بابا کے حضور۔ بابا تیرے بچے بیٹا عنایت کریں گے"، ماں اپنی بیٹی کو لائی تھی "تجھے اچھا سا بر ملے گا"، منتیں، مرادیں، مانگی جا رہی تھیں۔ چڑھاوے چڑھ رہے تھے۔

اب ہم قلعے پر چڑھ رہے تھے سارا قلعہ سمار ہو چکا ہے دو تین مقبرے باقی رہ گئے ہیں۔ ہم جوتے اتار کر شیخ بہاؤ الدین ذکریا ملتانی کے مزار میں داخل ہوئے جو احترام مسجدوں کو نصیب نہیں ہے وہ ان مزاروں میں پیدا کیا گیا ہے دروازے پر دو سفید ریش بزرگ تلاوت کلام پاک میں مصروف تھے۔ مزار کا بہت اونچا گنبد تھا۔ اور روشنی کا کہیں گذر نہ تھا۔ چھت میں جھاڑیں لٹکی ہوئی تھیں۔ ایک کونے میں ایک نوجوان سے صاحب۔ ذرا ذرا سی داڑھی۔ سر جھکائے۔ ہاتھ میں تسبیح لئے۔ ہل ہل کر کوئی جلالی وظیفہ پڑھ رہے تھے ہماری طرف کوئی توجہ بھی نہ دی۔ معلوم نہیں ان پر کس بات کا بھوت سوار تھا؟

اندر کافی تعداد میں قبریں بنی ہوئی تھیں جو سب سے اونچی اور بڑی تھی۔ وہ شیخ کی تھی۔ ہمارا ننگے والا ہم سے زیادہ ثواب کا خواہشمند

Marfat.com

تھا۔ یہاں بھی اس نے وہی حرکتیں کیں۔ مزار کے پاس ایک مندر بھی تھا
میں نے پوچھا "یہ مندر کیسا ہے؟"

"شیخ بہاؤالدین بڑے جلالی پیر تھے" تانگے والا کہنے لگا "ایک سادھو شیخ کو بہت مانتا تھا مگر ایک دن شیخ سے کہنے لگا میں آپ کو اپنا کمال دکھاتا ہوں، یہ کہہ کر اپنی لٹیا اوپر اچھالی۔ وہ بہت اونچی چلی گئی۔ شیخ صاحب نے کچھ پڑھ کر دم کر دیا۔ وہ لٹیا گری اور اس کے سر پر گری بس ۔۔ یہ مندر اسی لئے بنا دیا گیا" مندر میں تالا پڑا تھا۔ اس لیے ہم نہ دیکھ سکے راستے میں ایک مزار اور دیکھا جو حال ہی میں بنا تھا۔ کسی فقیر کا تھا۔

فقیر کے مزار کے پیچھے سرخ پتھر کی انگریزی طرز کی ایک لاٹ بنی تھی۔ یہ لاٹ ان تمام انگریز سپاہیوں کی یاد میں بنائی گئی تھی۔ جو ملتان کی جنگ میں مارے گئے تھے۔

ہم شاہ رکن عالم کے مزار میں داخل ہوئے دروازے پر بہت سے فقیر بیٹھے تھے۔ دوسرے مزاروں کی طرح یہ بھی تھا۔۔ تاریکی چمگادڑوں کی بیٹ کی بدبو، لوبان کی بو۔ سڑی ہوئی بند ہوا۔۔ ایک صاحب نہایت اطمینان سے لیٹے ہوئے تسبیح پڑھ رہے تھے۔ میں بھاگا اور باہر آکر کھلی فضا میں سانس لینے لگا۔

ہم ایک ٹوٹے ہوئے برج پر چڑھ گئے۔ یہاں سے دور دور چاروں طرف کا منظر دکھائی دیتا تھا۔ تانگے والا ہمیں بتانے لگا۔ "وہ کپڑے کا مل ہے ۔ وہ دیکھئے! ادھر ریل کا اسٹیشن ہے ادھر چھاؤنی

Marfat.com

ہے ــــ یہ گھنٹہ گھر ہے۔"

یہاں اب کوئی قابل دید جگہ باقی نہ تھی، اس لئے ہم ہوٹل واپس آگئے۔ ابھی کافی دن تھا میں نے ممو بھیا سے پوچھا "سینما چلتے ہیں" ؟؟ کہنے لگے "بھیا! ہم تو اوپر چھت پر لیٹیں گے" اور تکیہ لیکر اوپر چلے گئے۔

میں نے تانگہ کیا اور بازار چلدیا۔ پرانے شہر کے ایک دروازے پر اُتر کر شہر کے تنگ و تاریک بازار میں چلا گیا۔ بازار ابتدا میں تو بہت تنگ ہے مگر جوں جوں اندر بڑھتے جائیں چوڑا ہوتا گیا ہے۔ آگے جا کر ایک چوک ملتا ہے۔ یہاں پرانے زمانے کی ایک جامع مسجد بھی بنی ہے میں نے مسجد کو باہر ہی سے جھانک کر دیکھا اور ایک دوسرے راستے سے واپس ہُوا۔ اس طرف کپڑے کی چھپائی ہو رہی تھی۔

میں ایک ہوٹل میں بیٹھ گیا اور لسّی کا آرڈر دے دیا۔ لسّی اچھی نہ تھی۔ مختلف سینماؤں کے چکر لگائے۔ وقت اور ممو بھیا کے نہ ہونے کی وجہ سے ہوٹل واپس آگیا۔ ممو بھیا خراٹے لے رہے تھے۔ اجی اُٹھئے کھانا نہ کھائیے گا؟ ــــ ممو بھیا آنکھیں ملتے ہوئے اٹھے اور کھا تا کھا کر پھر سو گئے۔ میں نے اخراجات کا حساب لکھا۔ چھت پر بستر کر کے سو گیا۔ رات کافی ٹھنڈی اور خوشگوار تھی۔ خوب نیند آئی۔

صبح آسمان پر ہلکے ہلکے بادل چھائے تھے۔ موسم بڑا خوشگوار تھا۔ ہم چھت پر کھڑے موسم اور منظر کا لطف اٹھا رہے تھے۔ موجودہ ملتان

Marfat.com

عجیب طرح لیا ہے آبادی کے درمیان کھیت اور گاؤں آگئے ہیں۔

ہوٹل کے پیچھے سے ایک چھوٹی سی نہر بہتی ہوئی جا رہی تھی۔ پاس ہی ایک گاؤں تھا۔ نہر کے کنارے ایک گھر کے باہر درخت پر جھولا پڑا تھا اور ڈھولک کے ساتھ گانے کی آواز آ رہی تھی۔

یہ پنجاب تھا۔ پنجاب کے زندہ دل بیٹے اور بیٹیاں گا رہی تھیں بجا رہی تھیں اور کھلکھلا رہی تھیں۔ یہ شوخی۔ یہ شرارت۔ یہ زندہ دلی۔ یہ زندگی کی رو۔ گانا بجانا یہاں کا خاصہ ہے۔

پنجاب کا بیٹا ہل چلاتا ہے۔ دھرتی کا سینہ چیر کر، چلچلاتی دھوپ اور کڑکڑاتے جاڑے میں فصل اُگاتا ہے۔ فصل کٹتی ہے خوشیاں مناتا ہے ناچتا اور گاتا ہے۔ الاؤ کے گرد بیٹھ کر سوہنی اور مہیوال کے قصے سنتا ہے۔ چاندنی راتوں میں ہیر و رانجھا کے درد بھرے نغمے گاتا ہے۔ دودھ اور لسی پیتا ہے۔ فولاد جیسا مضبوط بدن بناتا ہے سینہ تان کر اور پھُلا کر چلتا ہے۔ امن کے لیے جنگ ہوتی ہے تو فوج میں بھرتی ہو جاتا ہے۔ لفٹ رائٹ، کرتا ہے گولی کھاتا ہے مر جاتا ہے وکٹوریہ[1] کراس اُس کے سینے پر سجا دیا جاتا ہے۔ پھر اس کی زرد رنگت اور بے نور آنکھیں۔

جنگ سے امن قائم ہو جاتا ہے۔ ایک ہیر۔ ایک سوہنی، ایک پنجاب کی بیٹی بیوہ ہو جاتی ہے جو چاندنی راتوں میں ڈھولک پر گیت گاتی تھی۔ سہیلیوں کے ساتھ کنوئیں پر پانی بھرنے جاتی تھی ہنستی

---

[1] یہ انگریزی دور کی بات ہے اس وقت تک "نشان حیدر" کا کوئی نشان نہ تھا۔

Marfat.com

تھی منہاتی تھی ۔ طبیعت پر کھا نا لے کر جاتی تھی ۔ جس کی گود ابھی ہری بھی نہ ہو پائی تھی اور امید کی کلی کھلنے بھی نہ پائی تھی ۔

ہمیں جناب ایکسپریس لینا تھا ۔ لائل پور کا ارادہ ترک کر دیا کیوں کہ وہاں زراعتی کالج کے علاوہ کوئی خاص چیز نہ تھی ۔ ملتان پر ٹیکسلا کا ٹکٹ نہ مل سکا اس لئے مجبوراً راولپنڈی کا لینا پڑا ۔ خانیوال پر کھانا خریدا بلا کی مرچیں تھیں ۔ پانی کی جلدی میں اُلٹا سیدھا جلدی جلدی کھانا کھایا ۔ نل کا گرم گرم اور ٹھنڈا ہوا پانی پیا ۔ گاڑی چلدی ، ہم نے لاہور کی لائین چھوڑ دی تھی اور لائل پور سے وزیرآباد ہو کر ٹیکسلا جا رہے تھے ۔ دور دور تک جنگل دکھائی دیتے تھے کہیں کہیں جنگلوں اور ریت کے ٹیلوں میں سے نہریں جا رہی تھیں گرمی اور دھوپ بہت تیز تھی ۔ راوی کا پل آیا ۔

ایک اسٹیشن پر کچھ لوگ سوار ہوئے جو شکل صورت اور لباس سے غیر مسلم معلوم ہوتے تھے میں نے قریب بیٹھے ہوئے پنجابی کسان سے پوچھا ۔

" یہ کون لوگ ہیں " — ؟؟

" جانگلی ہیں — جانگلی "

" جانگلی — ! کیا جنگل میں رہتے ہیں — ؟ ہندو ہیں ؟؟ "

اُس نے ہنس کر جواب دیا " ہاں جنگل میں تو رہتے ہیں مگر ہندو نہیں ہیں — مسلمان ہیں "

Marfat.com

عجیب طرح کے لوگ تھے ۔ کالے کالے ۔ چوڑی چوڑی چھاتی لمبے لمبے بال۔ بڑی بڑی وحشی ہرنوں کی سی آنکھیں ۔ سر پر پگڑی ۔ لنگیاں باندھے ۔ عورتیں بھی لنگیاں باندھے ہوئے تھیں۔

گاڑی تیزی میں چلی جارہی تھی ۔ دور کالے کالے بادل چھارہے تھے ۔ بادل قریب آتے گئے ۔ آندھی آئی اور چلی گئی ۔ ٹھنڈی ہوا چلنے لگی ایک صاحب کے پاس گراموفون تھا۔ پھر کیا تھا۔

برسات میں !.... تم سے ملے ہم ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

معلوم ہوتا تھا، کہ سارے پنجاب پر کالی گھٹائیں منڈلا رہی ہیں بادل گھل گھل کر برس رہے ہیں۔ حالانکہ بارش کا کوسوں پتہ نہ تھا۔ متر اور فضا بہت دلکش ہوگئی تھی۔ رکارڈ پر رکارڈ بجائے جانے لگے ساڑھے چار بجے لائل پور آگیا۔ میں اسٹیشن پر اتر کر ٹہلنے لگا۔ ٹہلتے ٹہلتے پیچھے گیا۔

ارے ۔ تو یہاں کہاں ۔ ؟ یہ غلام حسین ہمارے یہاں کا نوکر تھا جس کو کسی وجہ سے گھر والوں نے نکال دیا تھا۔ جس طرح گھر میں دانت نکال کر ہنستا تھا۔ اسی طرح ہنس کر کہنے لگا۔

"سرگودھا اپنے گھر جارہا ہوں۔ اسی ٹرین سے اترا ہوں ۔ یہاں گاڑی بدلنا ہے ۔

"چل ماموں جان سے تو مل لے ۔"؛ وہ ممو بھیا کو ماموں جان کہتا تھا جس طرح گھر کے سب بچے کہا کرتے تھے۔ ممو بھیا سے بڑے

Marfat.com

تپاک سے اور دانت نکال کر ملا۔

راستے میں جو گاؤں دیکھنے میں آئے وہ باقاعدہ اور ترتیب سے بسے ہوئے تھے سیدھی سیدھی گلیاں تھیں اس طرح کہ ایک گلی کے سامنے دوسری گلی ۔ مکان مٹی کے بنے تھے ۔ جسطرح یوپی (U.P.) میں ہوتے ہیں ۔ یہاں کے کسانوں اور یوپی کے کسانوں میں شکل وصورت اور لباس میں مجھے بہت کم فرق معلوم ہوا صرف زبان میں فرق تھا ۔ دبلے پتلے ۔ کالے کالے ۔ آنکھیں اندر دھنسی ہوئیں ۔ ایک اسٹیشن پر کچھ مراثی ہارمونیم اور طبلا لے کر چڑھ گئے ۔ لہک لہک کر پنجابی میں گانے لگے جب گانا ختم کر چکے تو سب نے پیسے دیئے ہم نے بھی دیئے کوئی گا کر دل خوش کر کے مانگے تو برا بھی نہیں معلوم ہوتا ۔ بجائے اس کے دبایا ۔ اللہ کی راہ پڑا اور ہاتھ پھیلا دیا ۔

سورج جھک چلا تھا ۔ گاڑی میدانوں جنگلوں اور کھیتوں میں فراٹے بھرتی چلی جا رہی تھی ۔ شام ہوتے ہوتے ہم وزیرآباد پہنچے میں اسٹیشن پر اُترا ۔ پلیٹ فارم فوجی بوٹوں کی ٹاپوں اور رائیفلوں کی جھنکاروں سے گونج رہا تھا ۔ میرا دل دہلنے لگا ۔ یہ فوجی کہیں جا رہے تھے ۔ ہم نے ناشتہ کیا ۔ یہاں کے چاقو کافی مشہور اور سستے ہوتے ہیں ۔ میرا ارادہ ہوا کہ دوستوں کو تحفہ دینے کے لئے خرید لوں ۔ مگر اس خیال سے کہ ابھی کون لاد کر لے جائے نہیں خریدے ۔

وزیرآباد نکلتے ہی چناب کا پل آیا ۔ چناب ۔ جس کی طوفانی

لہر دل میں سوہنی میری محبت کی خاطر بے خطر کود پڑی تھی۔

گجرات آیا۔ نکل گیا۔ جہلم کا پل آیا۔ پل کے بعد ہی جہلم کا اسٹیشن آگیا۔ میں نے ٹکٹ بڑھوانے کی بڑی کوشش کی مگر بے سود۔ گاڑی میں ایک بھی ٹکٹ چیکر نہ تھا۔ گارڈ نے انکار کر دیا کہنے لگا، راولپنڈی پر بنوا لیجئے گا۔

مجھ جیسا شاطر ڈبلیو۔ ٹی (W.T. بلا ٹکٹ) ریلوے کے پروپیگنڈے کا شکار ہو گیا تھا، اور ڈر رہا تھا کہیں دو ایک کے تیرا نہ بھرنا پڑیں۔ راولپنڈی پر گاڑی ٹھہری ہی تھی کہ موسلا دھار بارش ہونے لگی۔ میرا ارادہ تھا۔ کہ باہر سے ٹکٹ لے آؤں گا۔ مگر اب ناممکن تھا۔ ڈبے کی چھت ٹپکنے لگی۔ میرا بستر کافی بھیگ گیا۔ کچھ فوجیوں کا سامان بھی بھیگا یہ تھرڈ کلاس میں بیٹھنے کی سزا تھی۔

گاڑی پہاڑوں میں جا رہی تھی۔ یہ ہمالیہ کے سلسلے تھے ہمالیہ پہاڑ سب سے قریب زمانے میں وجود میں آئے ہیں۔ انہیں جوان سال لہریئے دار پہاڑ کہتے ہیں۔ یہ زمین کی عظیم برقی حرکات کے باعث وجود میں آئے ہیں۔ جسطرح سمندر میں لہریں آتی ہیں۔ اسی طرح ان عظیم حرکات سے لہریں آئیں۔ یہ زمینی لہریں تھیں۔ ایک کے پیچھے دوسری ——— اور دوسری کے پیچھے تیسری مسلسل لہریں آتی رہیں۔ اور یہ پہاڑ وجود میں آ گئے۔

ہمیں اندھیرے میں بہت کم دکھائی دیتا تھا۔ بارش ہو رہی تھی۔

Marfat.com

گاڑی اکثر جگہ سرنگوں میں دندناتی جا رہی تھی کہیں مڑتی کہیں نالوں کے پل عبور کرتی اور کہیں گھاٹیوں میں سے گذرتی جا رہی تھی۔ گولڑہ جنکشن پر بارش رک چکی تھی۔ گولڑہ سطح سمندر سے دو ہزار فٹ بلند ہے کراچی سے پشاور تک اتنا اونچا مقام کوئی نہیں ہے۔

## ٹیکسلا

رات کے ایک بجے ٹیکسلا آیا ہم اترے۔ میں ڈر رہا تھا کہ "دو ایک کے نمبرا" بھرنا پڑیں گے۔ مگر سوچ لیا تھا کہ بچنے کی کوشش کروں گا صورت حال بتاؤں گا۔ انگریزی میں بات کروں گا۔ انگریزی میں بات کرنے سے بڑے بڑے جرم ہلکے ہو جاتے ہیں۔ صاحب لوگوں کی زبان جو ٹھہری۔ گیٹ پر ٹکٹ دیئے۔

"صاحب ٹھہریئے"

"ہاں سیا ہاں ٹھہرتا ہوں"، میں نے بستر ایک طرف رکھ دیا اور اپنے کو بے قصور ثابت کرنے لگا۔

"ملتان میں ٹیکسلا کے ٹکٹ نہیں ملے راستے میں کوشش کی کہ ٹیکسلا تک بڑھ جائے مگر گاڑی میں کوئی ٹی۔ ٹی (ٹکٹ چیکر) ہی نہیں تھا۔ راولپنڈی پر بارش ہونے لگی اس لئے ہم مجبور تھے"

وہ خاموش بڑے غور سے ان دلائل کو سنتا رہا پھر کہنے لگا "اچھا ۔۔۔ اگاڑی میں ٹی ۔ ٹی نہیں تھا اور آپ نے کوشش کی ۔ تو خبر جاتے

Marfat.com

دیجیئے ۔ لائیے دو روپے دو آنے"

"راولپنڈی سے یہاں تک کے ۲ سنگل (اکہرا)؟" مجھے شک تھا کہیں ڈبل نہ چارج کرلے۔

"ہاں صاحب"

میں نے دو روپے کا ایک نوٹ نکال کر دے دیا اور موبھیا سے کہا دو آنے دے دیجئے۔

"جانے دیجئے دو آنے نہیں ہیں تو نہ سہی ۔"

خدا مِن فضل رہی، کیوں کہ ہم رسید نہیں دی گئی تھی۔ تھرڈ کلاس کے شیڈ میں آتے ہی پھر بارش شروع ہو گئی۔ مسافروں کا ہجوم۔ جگہ کی قلت سے بڑی مشکل تھی ٹیکسلا جنکشن بھی تھا۔ یہاں سے حویلیاں (ایبٹ آباد) کو گاڑی جاتی تھی۔ اس لئے اور بھی زیادہ مسافر تھے۔

جب بارش تھمی تو میں اسٹیشن کے اندر گیا تاکہ پہلے اور دوسرے درجے کے ویٹنگ روم کا پتہ لگاؤں وہاں جا کر دیکھا اندر سے چٹخنی لگی تھی اور ہلکی ہلکی روشنی ہو رہی تھی۔ میں نے دروازہ کھٹکھٹایا ایک بڑے میاں آئے جو اسٹیشن کی طرف سے ملازم تھے۔

"کیا ہے صاحب!"

"دروازہ کھولو ۔ ہمیں سونا ہے؟!"

"آپ کے پاس ٹکٹ کونسا ہے؟"

"ٹکٹ تو تھرڈ کلاس کا ہے!"

Marfat.com

"پھر دروازہ نہیں کھلے گا ۔۔۔!!"

میں دل ہی دل میں کڑھتا اور اس سرمایہ دارانہ تفریق کو کوستا واپس ہوا مجبوراً ہم اپنا سامان اٹھا کر ویٹنگ روم کے باہر والے برآمدے میں لے آئے اور لیڈیز ویٹنگ روم کے دروازے کے سامنے بستر کھول دیئے۔

ایک سپاہی کہنے لگا "یہاں سے ہٹیے۔ دیکھتے نہیں یہ لیڈیز ویٹنگ روم کا دروازہ ہے؟"۔

ہم نے کہا۔ جب لیڈی صاحبہ آئیں گی تب دیکھا جائے گا ابھی تو یہاں سے نہیں ہٹیں گے چاہے کچھ ہو جائے" اور چادر تان لی سپاہی بڑبڑاتا ہی رہا۔ ہم سو گئے۔

صبح ہمارے بستروں کے چاروں طرف جھاڑو دی جا رہی تھی اور شاید ذرا دیر نہ اٹھتے تو ڈر تھا کہ بھنگی ہمیں بھی جھاڑ دیتا۔ صبح کی ضروریات سے فراغت حاصل کی۔ سامنے سے لائینوں کے پار دو تین پھوس کے ہوٹل بنے تھے وہاں جا کر ناشتہ کیا۔

کلکتہ میں رہا ہوا ایک شخص مل گیا کہنے لگا "میں بہت اچھا ستار بجا تا جانتا ہوں، میرے پاس سرٹیفکیٹ بھی ہیں ۔۔ یہ دیکھئے" سرٹیفکیٹ نکال کر دکھانے لگا۔ ہم نے کہا "تم یہاں کیوں آ گئے؟ ہندوستان میں تو تمہاری بڑی قدر ہوتی"

"فساد نہ ہوتا تو نہ آتا" وہ کہنے لگا "سب ساتھی چلے

Marfat.com

آئے میں بھی چلا آیا۔ ادھر روزگار کی بڑی تنگی ہے۔ راولپنڈی میں درخواست دی ہے کہا ہے۔ جب ریڈیو اسٹیشن چالو ہوگا تو ضرور بلالیں گے"

ہم نے ہوٹل میں سامان رکھا ایک تانگہ کیا اور ٹکسیلا دیکھنے روانہ ہو گئے۔ ہمارے تانگے والے بڑے معقول اور حافظ قرآن تھے راستے بھر وہ زیر لب قرآن پڑھتے رہے۔ ہم انہیں کے مشورے پر چل رہے تھے۔ انہوں نے ہمیں بتایا کہ یہاں کئی جگہیں ( SITE ) دیکھنے کی ہیں۔ سب سے دور جولیاں میں بدھوں کی خانقاہ ہے۔ جو یہاں سے پانچ میل دور ایک چھوٹی سی پہاڑی پر واقع ہے۔ اور دوسری جگہیں قریب ہیں اس لئے سب سے پہلے ہم خانقاہ دیکھنے روانہ ہوئے۔

ہر جگہ جانے کے لئے تارکول کی پختہ سڑک بنی تھی، ہم ایک کافی چوڑی وادی میں جا رہے تھے اور ہمارے چاروں طرف دو دو تین تین میل کے فاصلے پر پہاڑوں کے اونچے سلسلے تھے۔ وادی میں کہیں کہیں باغات بھی تھے جن میں شہتوت اور ناخوں کے درخت زیادہ تھے۔ کسی کسی باغ میں آم کے درخت بھی دیکھنے میں آئے۔ ہم عجائب گھر اور کچھ دوسری جگہیں جنہیں ہمیں بعد میں دیکھنا تھا، چھوڑ کر ہری پور ہزارہ جانے والی سڑک پر جا رہے تھے یہ سڑک ہری پور ہزارہ ہوکر ایبٹ آباد تک جاتی تھی جولیاں تک تو پختہ تھی پھر وہاں سے کچی ہو گئی تھی۔ راستے میں پہاڑی نالے بہت پڑتے تھے۔ اس لیے بارش میں بند

Marfat.com

ہو جاتی تھی۔

میں نے حافظ جی سے پوچھا "دریائے سندھ یہاں سے کتنی دُور ہے"؟ "دیکھئے سامنے وہ پہاڑ ہے جس کی چوٹی پر سفید عمارت نظر آتی ہے۔ وہ سخی داتا کی زیارت ہے اور پہاڑ کے پیچھے دریا ہے"۔ ایک بہت اونچے پہاڑ پر ایک سفید عمارت نظر آ رہی تھی۔ دُور شمال مغرب میں اور پہاڑ کے دامن سے دھواں اُٹھ رہا تھا یہ "واہ" تھا۔

"پنجاب میں "واہ" کے مقام پر سیمنٹ کے کارخانے ہیں۔ میں جغرافیہ میں پڑھتا تھا۔ آج واہ اور سیمنٹ کے کارخانے میری آنکھوں کے سامنے تھے۔

ہم ایک ایسے مقام پر پہنچے جہاں حد بندی کا پتھر لگا ہوا تھا۔ میں نے غور سے پڑھا۔ پتھر کے ایک طرف اردو میں "راولپنڈی" اور دوسری طرف "ہزارہ" لکھا ہوا تھا۔ اب ہم صوبہ سرحد میں داخل ہو گئے تھے۔ ٹیکسلا کی عظیم الشان سلطنت آج اس طرح بٹ گئی تھی۔ نہ جانے کب کب اور کتنی مرتبہ اور کہاں کہاں سے اس سلطنت کے حصے بخرے کئے گئے ہوں گے!؟

یہیں ایک چھوٹے سے پہاڑ پر جولیاں بستی نظر آ رہی تھی۔ یہاں سے ہری پور جانے والی کچی سڑک پختہ سڑک سے جدا ہو کر پہاڑوں ندیوں نالوں اور جنگلوں میں جانے کہاں کھو گئی تھی اور ہم بدستور پختہ سڑک

Marfat.com

پر جارہے تھے۔ ہم ایک تنگ درے سے ہو کر نکلے۔ تھوڑی دور تک سایہ دار درختوں میں چل کر ہمارا تانگہ ایک جگہ رُک گیا۔ یہاں سے سڑک ختم تھی اور ایک پگڈنڈی پہاڑی نالے میں ہو کر پہاڑ کی چوٹی پر جاتی تھی حافظ جی بولے "جائیے۔ سامنے کے پہاڑ پر چڑھ جائیے۔ وہاں آدمی ہوگا۔ آپ کو سب کچھ دکھائے گا۔"

ہم تانگے سے اُتر پڑے۔ رات کی بارش کا پانی نالے میں بہہ کر آرہا تھا۔ پتھروں پر پیر رکھتے ہوئے نالے کو پار کر گئے۔ یہاں سے چڑھائی تھی۔ کانٹے دار جھاڑیوں میں ہو کر پگڈنڈی اوپر جاتی تھی۔ ہم ہانپتے کانپتے کوئی تین سو فٹ اونچے پہاڑ پر چڑھ گئے۔ محکمۂ آثار قدیمہ کے ملازم نے ہمارا استقبال کیا۔

"پاس ہے آپ کے پاس"؟

"نہیں"

"اچھا میں لاتا ہوں آپ یہیں ٹھہریئے"

ہم دروازے پر ٹھہر گئے۔ بات یہ تھی کہ پہلے ہمیں ابتدائی جگہیں دیکھنا چاہئے تھیں۔ جو پاس اُن جگہوں کے لئے استعمال ہونا تھا وہ بعد میں یہاں دکھایا جاتا تھا۔ اس کے علاوہ دروازے پر تختی لگی تھی "بغیر پاس اندر داخل ہونا منع ہے" ہم دروازے پر کھڑے ہوئے چاروں طرف کا منظر دیکھ رہے تھے۔

جس پہاڑ پر ہم کھڑے تھے وہ دوسرے پہاڑوں سے نیچا تھا

Marfat.com

— دور — دور اونچے اونچے پہاڑ — نیچے شور مچاتا۔ پتھروں سے ٹکراتا پہاڑی نالا بہا جا رہا تھا۔ سامنے سڑک تھی جس پر دورویہ سایہ دار درخت کچھ دور تک لگے ہوئے تھے۔ چھوٹی سی پہاڑی پر جھونپڑیوں کی بستی آباد تھی — کچے مکانوں سے دھواں نکل رہا تھا — دور پہاڑ کے دامن میں ایک چھوٹا سا دریا بہہ رہا تھا۔ آسمان پر بادل چھائے تھے — اس مقام۔ اس منظر اور اس فضا نے سانچی کی یاد تازہ کر دی۔

سانچی کا اسٹوپ — چھوٹا سا پہاڑ — نیچے ریل کی لائین — چاروں طرف سبز سبز پہاڑ — سامنے بیتوا[1] ایک سانپ کی طرح بل کھائے لہراتا ہوا جا رہا ہے۔ آسمان پر ہلکے ہلکے بادل چھائے ہیں۔ بارش ہو کر رکی ہے جگہ جگہ تالاب سے بھر گئے ہیں — پہاڑ کے دامن میں ڈاک بنگلہ ہے جس میں ہم نے رات گذاری ہے اور رات بھر ہم میں سے ایک صاحب خوب بہکے — وہی منظر وہی فضا وہی بدھوں کی خانقاہ —

اتنے میں ملازم پاس لے کر آ گیا۔ ہم نے چار آنے دیئے اور اندر داخل ہو گئے۔ ہمارے سامنے سب سے بڑا اسٹوپ تھا جو بہت زیادہ شکستہ ہو گیا تھا مگر لوہے کی سلاخیں اور ٹین کی چادریں لگا کر مزید شکستہ ہونے سے روک دیا گیا تھا۔

"اس میں بدھ اپنی راکھ دفناتے تھے" ملازم بولا

ہمارے سامنے کئی اور چھوٹے چھوٹے اسٹوپ تھے ان اسٹوپوں

[1] بیتوا ریاست بھوپال (وسط ہند) کا مشہور دریا۔

Marfat.com

کے چاروں طرف بدھوں کے بڑے بڑے بھکشوؤں کی مورتیاں بنی ہیں یہ مورتیاں زیادہ تر چکنی مٹی یا چونے کی بنائی گئی ہیں۔ اکثر ٹوٹ پھوٹ گئی ہیں۔ مہاتما بدھ کی مورتیاں بھی ہیں۔ مہاتما بدھ کی مورتیاں اور بھشکوؤں کی وہ مورتیں جنہیں بہت قیمتی خیال کیا گیا ہے یہاں سے نکال کر ٹیکسلا کے میوزیم میں رکھدی گئی ہیں۔ اور ان کی جگہ نقلی بنا کر لگا دی ہیں۔ مہاتما بدھ کی کچھ مورتیں ایسی بھی تھیں۔ جنہیں اپنی جگہ سے ہٹانے سے ٹوٹ جانے کا خطرہ تھا۔ ان کو الماریوں میں مقفل کر دیا تھا۔ ملازم تالے کھول کھول کر دکھاتا تھا۔

عمارت نہایت مضبوط۔ چمکدار۔ کالے اور چکنے پتھر کی بنی ہے پتھر باقاعدہ تراش کر اور صاف کر کے لگایا گیا ہے یہاں صرف ایک عمارت ہے سانچی میں کئی عمارتیں ہیں جو کافی چوڑے پہاڑ پر پھیلی ہوئی ہیں۔ اس عمارت کے مختلف حصے ہیں ــــ باورچی خانہ مودی خانہ مجلسی ہال، بھکشوؤں کے رہنے کے لئے چھوٹی چھوٹی کوٹھریاں۔ نہانے کے لئے ایک حوض۔ حوض کے پاس کپڑے پہننے کی ایک کوٹھری۔ باورچی خانے میں آٹا گوندھنے کا پیالے نما ایک بڑا پتھر سل اور بٹہ بھی رکھا تھا۔ کسی کسی کوٹھری میں مٹی کی ہانڈی یا بڑا مٹکا زمین میں گڑا ہوا ملا تھا۔

میں نے پوچھا "روز کتنے آدمی دیکھنے آتے ہیں؟"

گائیڈ نے ایک لمبی سانس بھری "ابھی تو بالکل نہیں آتا۔ پاکستان سے پہلے بنگالی بابو اور انگریز بہت آتا تھا"

Marfat.com

مو بھیا نے ملاقاتی کتاب میں دستخط کئے۔ ہم پہاڑ سے نیچے آئے نلے پر بیٹھ کر منہ ہاتھ دھوئے اور بارش کا بہتا ہوا ٹھنڈا ٹھنڈا پانی پیا۔

ہم واپس ہوئے اور پھر راولپنڈی کی سرحد میں داخل ہو گئے تھوڑی دور چلنے کے بعد ہمارا تانگہ اصل سڑک سے مڑ کر ایک دوسری سڑک پر ہو گیا یہ سڑک دوبارہ "ہزارہ" میں داخل ہو گئی۔ یہاں بھی راولپنڈی اور "ہزارہ" کی سرحد کا پتھر لگا ہوا تھا۔ ہم ایک دوسری جگہ دیکھنے جا رہے تھے یہ جگہ "جنڈال" کہلاتی تھی یہاں ایرانیوں کا مندر تھا ٹیکسلا میں اس وقت جتنے بھی آثار کھود کر نکالے گئے ہیں وہ زیادہ تر سکندر یا اسکے بعد کے زمانے کے ہیں۔ یہاں ہمیں کوئی خاص بات نہیں معلوم ہوئی چھوٹی سی جگہ تھی۔ ایک بڑا ہال تھا۔ ہال کے پیچھے کچھ کمرے بنے ہوئے تھے۔ سامنے ستونوں کے آثار معلوم ہوتے تھے۔ ستونوں کے گول پتھر ادھر ادھر پڑے ہوئے تھے۔ بعض پتھروں کی گولائی سے معلوم ہوتا تھا کہ یہ شیروں کے دھڑ ہوں گے جو ٹوٹ کر بکھر گئے ہیں۔ شیر ایرانیوں کا قومی نشان ہے۔ آج بھی ایران کے جھنڈے اور شاہی نشان میں ایک شیر بنا ہوتا ہے۔ جو ایک پیر اٹھائے تلوار لئے کھڑا ہوتا ہے۔

یہاں سے ہم اصل ٹیکسلا شہر دیکھنے روانہ ہوئے اور شہر کے دروازے پر تانگے سے اتر گئے۔ شہر کا بڑا دروازہ باقاعدہ ترشے ہوئے پتھروں کا بنا ہوا ہے ایسے ہی ترشے ہوئے پتھروں کی شہر

Marfat.com

پناہ بھی ہے جو کہیں کہیں صاف دکھائی دیتی ہے اور کہیں کہیں زمین میں دھنسی ہوئی ہے پورا شہر چار یا پانچ میل کے رقبے میں پھیلا ہوا ہے شہر کا صرف ایک حصہ کھود کر نکالا گیا ہے۔ جس کو دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہاں کا "سول لائنز CIVIL LINES" ہو گا۔ کیوں کہ گائیڈ کے کہنے کے مطابق یہاں شاہی محلات اور حرم وغیرہ بھی بنتے ہیں۔ بڑا باقاعدہ ترتیب دیا ہوا شہر بسا ہے شہر کے وسط میں ایک بڑی اور چوڑی سڑک ہے جس کے دونوں طرف دوکانیں بنی ہیں اور دوکانوں کے پیچھے مکان ہیں راستے اور گلیاں ایک دوسرے کو کاٹتی ہوئی گذرتی ہیں۔

یہاں بھی گائیڈ نے ہمارا استقبال کیا۔ گائیڈ اچھی طرح اردو نہ بول سکتا تھا۔ بلکہ پنجابی میں بات کرتا تھا۔ باتیں بڑی مشکل سے سمجھ میں آتی تھیں

زبان یار من ترکی ومن ترکی نمی دانم

والا مضمون تھا۔

ہم درمیانی بڑی سڑک پر چل رہے تھے۔ یہ بازار ہو گا کیونکہ دو دو دوکانوں کے آثار معلوم ہوتے تھے۔ گائیڈ نے ہمیں ایک اسٹوپ دکھایا یہ اسٹوپ ہو بہو سانچی کے بڑے اسٹوپ کی طرح معلوم ہوتا تھا پیچھے ایک عقبی مکان میں اس نے بتایا کہ یہاں سے ایک بڑا اور قیمتی اشیا کا خزانہ برآمد ہوا تھا۔ اسٹوپ کے بعد تھوڑی دور پر ایرانیوں کا ایک مندر تھا اس مندر کے بعد ایک یونانیوں کا مندر تھا۔ یونانیوں کے مندر کی دیوار پر جیوپیٹر (JUPITER) دیوتا کی مورت بنی تھی اور قریب ہی ایک

Marfat.com

اڑتے ہوئے عقاب کی مورت بھی بنی تھی۔ ان دونوں مورتیوں سے معلوم ہوتا تھا کہ یہ یونانیوں ہی کا مندر ہوگا، ٹکسیلا میں اس وقت ایرانی اور یونانی اثرات ایک ساتھ موجود تھے اور یہ شہر بدھوں کا بہت بڑا مرکز تھا۔

آخر میں گائیڈ نے خاص طور سے ایک جگہ لے جاکر دکھائی۔ یہ شاہی محل تھا۔ دیوان عام۔ دیوان خاص اور بیگمات کے لئے علیحدہ مکان بنے تھے ہر گائیڈ تھوڑا بہت تاریخ دان ضرور ہوتا ہے اور اپنا لیکچر بڑی اہمیت کے ساتھ دیتا ہے۔ ہمیں پندرہ بیس منٹ کی دماغ سوزی کے بعد اس جگہ کے متعلق ایک عجیب اور دلچسپ قصہ سمجھ میں آیا۔ گائیڈ پنجابی میں اپنا لیکچر دے رہا تھا اور ہم لوگ "ہوں" ہاں "اچھا" کیا مطلب" کہتے جا رہے تھے۔ اس لیکچر کا ماحصل یہ تھا۔

"شہنشاہ اشوک کی ایک رانی نہایت حسین۔ خوبصورت اور جوان تھی، وہ اشوک کی ایک دوسری رانی کے لڑکے یعنی اپنے سوتیلے بیٹے کی آنکھوں پر فریفتہ ہو گئی۔ یہ لڑکا باپ کی طرح نہایت حسین و جمیل نیک سیرت اور پاک دامن تھا۔ ایک مرتبہ اشوک کسی مہم پر گیا ہوا تھا۔ موقع غنیمت جان کر رانی نے مطلب برآری کی ہر چند کوشش کی مگر وہ اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہو سکی۔ اس غصے اور جلن میں رانی نے اشوک کو کہلا بھیجا کہ تمہارا بیٹا میری طرف سے بدنیت ہے لہذا اس کی آنکھیں نکلوا دی جائیں۔ یہ رانی اشوک کو بہت عزیز تھی۔ اشوک ٹکسیلا واپس آیا تو بیٹا اپنی آنکھیں نکلوا

Marfat.com

دینے پر راضی ہو گیا۔ کیونکہ اس کے نزدیک باپ کی خوشی سوتیلی ماں کی خوشی میں تھی اور وہ باپ کو ناخوش نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اس لئے اس نے مکار عورت کی سازش میں پھنس کر اپنی آنکھیں نکلوا دیں "۔

سامنے کے پہاڑ پر ایک چھوٹی سی عمارت کیطرف اشارہ کر کے اس نے بتایا کہ اس عمارت میں اشوک کے بیٹے نے اپنی آنکھیں نکلوا دی تھیں معلوم نہیں کہاں تک یہ قصہ ٹھیک ہے ؟

شہر کی فصیل دور تک پہاڑ کے پیچھے نہ جانے کہاں تک چلی گئی تھی ہم واپس ہو کر ایک دوسری جگہ جو زیادہ اہم نہ تھی دیکھنے روانہ ہوئے میوزیم کے پیچھے سے گذر کر ایک گاؤں کے پاس پہنچے ایک گاؤں والا پکی ہوئی نانگیں توڑ کر لا رہا تھا۔ ہم نے خریدیں اور مزے لے لے کر کھاتے رہے تھوڑی دور چلنے کے بعد وہ جگہ آگئی یہ جگہ کوئی خاص نہیں تھی یہاں کھدائی بھی بہت کم ہوئی تھی۔ ہمیں بڑی مایوسی ہوئی ہم عجائب گھر آئے اور ٹکٹ لے کر گائیڈ کے ساتھ ہو گئے

ہمیں عجائب گھر کی عمارت بہت پسند آئی۔ اس کا پائیں باغ تو نہایت دلفریب تھا۔ اس کے علاوہ عجائب گھر کا انتظام بہت اچھا تھا عجائب گھر میں آدمی ایک ایک چیز کو کافی غور سے دیکھتا ہے اور کھڑا رہنا پڑتا ہے جس کی وجہ سے وہ بہت جلد تھک جاتا ہے۔ اس مقصد کے لئے یہاں تھوڑی تھوڑی دور پر نہایت عمدہ اسپرنگ دار بنچیں پڑی تھیں۔

ہم ایک گھنٹے تک میوزیم دیکھتے رہے۔ زیادہ تر چھوٹی بڑی

Marfat.com

مورتیاں مہاتما بدھ کی تھیں۔ کہیں کہیں یونانیوں کے سر بھی نظر آئے۔ جو یونانیوں ہی نے بنائے تھے اور یہ سر سب سے نمایاں معلوم ہوتے تھے۔ یونانی اور ہندوستانی بت تراشی میں زمین و آسمان کا فرق ہے جو حسن۔ خوبصورتی۔ اصلیت نزاکت اور اعضا کی تراش خراش۔ چہرہ کا اتار چڑھاؤ یونانی بت تراشی میں پائی جاتی ہے۔ اس کا ہندوستانی بت تراشی میں دور دور تک پتہ نہیں۔ یونانیوں نے بت تراشی کو معراج کمال تک پہنچا دیا ہے۔ یونانیوں نے مہاتما بدھ کے مجسمے بھی بنائے تھے ہم نے اور بہت سی چیزیں دیکھیں جو تحریر میں نہیں لائی جا سکتیں۔

ماڈل میپ اور پلین میپ دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ٹیکسلا میں اور بھی کئی جگہیں ہیں جو بغیر کھدی پڑی ہیں۔ اور ان تک پہنچنے کا راستہ بھی نہیں ہے۔ اگر ہر جگہ دیکھی جائے تو کم سے کم چھ سات دن لگیں گے۔

ہمارا ارادہ حسن ابدال میں "پنجہ صاحب"[1] دیکھنے کا تھا۔ اس لئے ہم اسٹیشن آئے تاکہ بارہ بجے کی گاڑی لے سکیں۔ ہم اسٹیشن پہنچ رہے تھے اور گاڑی سیٹی دے کر دھک، دھک، کرتی ہوئی روانہ ہو چکی تھی۔

"اب کیا کیا جائے؟"

"آپ بس سے چلے جائیے۔ گرینڈ ٹرنک روڈ (شاہراہ اعظم) یہاں سے ایک میل ہے وہاں سے راولپنڈی، ایبٹ آباد اور پشاور جانے والی بسیں تھوڑی دیر بعد گذرتی ہیں۔ بس ضرور مل جائیگی"

---

[1] سکھوں کا مشہور گردوارہ جہاں ہر سال بیساکھی کا میلہ ہوتا ہے ساری دنیا سے سکھ شرکت کرنے آتے ہیں۔

Marfat.com

"تب تو ٹھیک ہے"!

ہم نے سامان لیا اور جی ٹی روڈ پر بس اسٹینڈ کے لئے چل پڑے ہم موجودہ ٹکسلا گاؤں سے گذرے۔ چھوٹا سا بازار۔ دیہاتی ہوٹل۔ مکئی کے بھٹے بھونے جا رہے تھے۔ وکٹوریہ شفاخانے کے پاس ایک کلیسا کے سامنے سے گذرے۔

"یہ امریکن گرجا اب بنا ہے پاکستان بننے کے بعد" کس حسرت کس افسوس اور کس یاس سے حافظ جی نے کہا۔ اُن کے اس کہنے میں ایک شکایت تھی۔ ایک طنز تھا۔ ایک درد تھا۔ ایک کسک تھی۔ میں نے ایک پُر معنے، طنز آمیز "ہوں" کیا)

جس سرزمین میں مہاتما بدھ نے امن و آشتی، صلح اور شانتی حق و انصاف سچائی، اخوت و مساوات، انسانی ہمدردی قربانی۔ ریاضیت، تیاگ اور بے غرضی کی شمع روشن کی تھی اور جس کی روشنی ہمالہ کی سر بلند چوٹیوں کو پار کر کے دُور دُور تک دنیا کو روشن اور منور کرتی رہی۔ آج اس سرزمین میں "شمع ڈالر" DOLLAR جلائی جا رہی تھی۔

دور ایک پہاڑ پر جہاں شاہراہ اعظم ایک چھوٹے سے درّے میں ہو کر آ رہی تھی ایک انگریزی طرز کی پتھر کی لاٹ دکھائی دیتی تھی۔ یہ لاٹ[1] کسی انگریزی مہم کی یاد تازہ کرتی تھی جو سکھوں کے خلاف لڑی گئی تھی۔

---

[1] جنرل نکلسن جس نے دہلی فتح کی تھی اس کی یاد میں یہ لاٹ بنائی گئی ہے۔

Marfat.com

ہم اسٹنڈ پر پہنچے یہاں شیر شاہ کے زمانے کی ایک سرائے بنی ہوئی تھی۔ جواب شکستہ حالت میں پڑی تھی۔ تھوڑی دیر بعد ہمیں بس مل گئی۔ ہماری بس ایک بہت بڑے میدان میں سے جا رہی تھی میدان کو تار لگا کر گھیر لیا گیا تھا۔ اور فیکٹریاں قائم کی جا رہی تھیں ہمارے سامنے واہ کا پہاڑ تھا اور اس کی چوٹی پر سخی داتا کی زیارت سفید سفید دکھائی دیتی تھی۔ پہاڑ کے ایک سرے پر واہ کے کارخانوں میں سے دھواں اٹھ رہا تھا اور دوسرے سرے پر حسن ابدال واقع تھا۔

## حسن ابدال

بس پہاڑ کے دامن میں نہایت سرسبز مقام پر ٹھہر گئی۔ یہاں ایک چشمہ تھا جو پہاڑ پر سے بہتا آ رہا تھا اور ایک باغ بھی تھا۔ ہم بس سے اتر پڑے۔ تانگے والے سے کہا ہمیں پنجہ صاحب، دیکھ کر اسٹیشن جانا ہے تانگے والا اردو سے ناآشنا تھا۔ ہم ایک اجاڑ دھوپ سے جھلسے ہوئے تپتے ہوئے شہر کی ویران اور اونچی نیچی سڑک پر جا رہے تھے۔ پہلے تو یہ سڑک کچھ دور تک پہاڑ پر چڑھی پھر نشیب میں اتر گئی ہم تھوڑی دور چلنے کے بعد پنجہ صاحب کے دروازے کے سامنے ایک پیپل کے درخت کے نیچے کھڑے ہو گئے پنجہ صاحب کا دروازہ ہمارے لئے بند تھا اور جیسے اب یہ صدیوں کے لئے بند ہو گیا ہو۔ سوال تھا کہ اب دیکھا کیسے جائے؟ تانگے والے نے پنجابی میں بتایا کہ اجازت تھانے سے ملے گی اور تھانہ اسی طرف ہے جدھر سے ہم لوگ آ رہے ہیں

Marfat.com

ہم نے اُس سے کہا کہ واپس چلو اور اجازت لے کر آؤ۔ تانگے والا واپسی پر راضی نہ ہوا۔ "پھر تسی کیوں نہیں کیوندیا کہ تھانے سے اجازت ملدی اے"؟ "یہ تسی گلتی اے۔ پہلے اجاجت کیوں نئیں لے لیوندی اے!" وہ بولا۔

میں نے کہا "یہ تسی غلطی ہے یا مینوں؟ ہم تو پردیسی ہیں تسی بتانا چاہئے تھا"۔ اس کو اپنی غلطی کا احساس ہونے لگا وہ شرمندہ سا معلوم ہوتا تھا۔ بہر حال آدھ گھنٹے کی حجت کے بعد وہ واپسی پر راضی ہوا۔ ہم پھر اُسی راستے سے واپس ہوئے اور شاہراہ اعظم پر تھانے کے سامنے تانگہ کھڑا کر دیا۔ تھانہ ایک چھوٹی سی پہاڑی پر بنا تھا۔ میں تانگے پر سے کود کر پہاڑی پر چڑھ کر تھانے میں پہنچا ایک لمبی لمبی مونچھوں والے تھانے دار سے ملاقات ہوئی معلوم ہوا ہم ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کی اجازت بغیر پنجہ صاحب، نہیں دیکھ سکتے۔ ہم مجبور ہو گئے۔ اگر دھوپ اور گرمی زیادہ نہ ہوتی تو سات آٹھ سو فٹ اونچے پہاڑ پر چڑھ کر "سچے دانا"[1] دیکھ کر اس کمی کی تلافی کرتے،

ہم شاہراہ اعظم چھوڑ کر ایبٹ آباد جانے والی سڑک پر ہو لئے یہی سڑک اسٹیشن بھی جاتی تھی۔ اسٹیشن پر سامان رکھ کر کھانے کی فکر ہوئی۔ کیونکہ بھوک بہت زور کی لگ رہی تھی۔ اسٹیشن کے باہر دو ہوٹل تھے ہم ایک ہوٹل میں پہنچے۔ ادھیڑ عمر کے ایک صاحب تہمد

---

[1] یہ بھی ایک زیارت گاہ ہے۔

Marfat.com

باندھے ہوٹل کے مالک سے بیٹھے تھے۔ ہم نے کھانا مانگا۔ کہنے لگے "
اس جنگل میں کھانے کو کیا ہے۔؟ یہاں تو چھولے کی دال ہوتی ہے
وہی حاضر ہے" ممو بھیا نے کہا ہم تو گوشت کھائیں گے۔؟!
ہوٹل میں گوشت نہیں تھا میں دوسرے ہوٹل سے گوشت لایا
—— چھولے کی دال اور گوشت —— پھر بھوک اپنے شباب پر
—— کھانے کا لطف آگیا۔ باتیں ہونے لگیں۔
ہم نے پوچھا "آپ کہاں سے ترک وطن کر کے آئے ہیں اور
یہاں کیا کرتے ہیں"
"ضلع مظفر نگر میں زمینداری تھی وہ سب چھوڑ دی۔ یہاں تھوڑی
سی زمین الاٹ ہو گئی ہے یہ بیٹے کی دوکان بھی الاٹ ہے دل گھبراتا ہے
تنہائی ہے پھر غیر زبان ہے۔ کسی سے باتیں کرنے میں لطف نہیں آتا
—— وہ اپنا گھر —— اپنا ماحول۔ اپنی زبان اب کہاں ——!! یہ میر صاحب
اکثر آجاتے ہیں تو ہم دونوں آپس میں باتیں کر لیتے ہیں۔ انہیں بھی زمین
الاٹ ہو گئی ہے۔ اسی لئے ہم دونوں یہاں جنگل میں پڑے ہوئے ہیں"
میر صاحب بھی اس وقت موجود تھے۔
میں نے کہا "زمینداریاں تو ختم ہو رہی ہیں۔؟ یوپی میں تو
قانون پاس ہو چکا ہے۔ یہاں بھی ہونے والا ہے؟ ——"
ایک لمبی اور ٹھنڈی سانس بھر کر بولے "کیا ہونے والا ہے
اب کیا حکومت یہ چاہتی ہے کہ زمیندار بھوکوں مر جائیں ——!!

Marfat.com

ہیں بل ادا کرنے لگا تو ——— کہنے لگے "ارے صاحب! آپ تو مہمان ہیں روز روز کون آتا ہے؟" ممو بھیا نے کہا آپ روز روز یونہی مہمان نوازی کرتے رہے تو آپ کا یہ ہوٹل مہمانوں ہی کا ہو جائے گا۔ ہم بل ادا کر کے اسٹیشن واپس آ گئے۔ ہمیں پاکستان ایکسپریس لینا تھا اس کے آنے میں ابھی تین گھنٹے باقی تھے۔

اشرف خان — قمیص اور شلوار پہنے۔ سر پر پگڑی باندھے جتنے بڑے خود تھے اس سے بڑی سونٹی ہاتھ میں لیے۔ چھوٹے سے۔ ننھے منے اشرف خان — مسکراتے۔ ہنستے کھلکھلاتے، شرمائے لجائے۔ اشرف خان — ممو بھیا ایک بنچ پر لیٹے اشرف خان کو بلاتے "اماں — اشرف خان — ادھر آؤ بھائی!" اور اشرف خان قریب آتے۔ ہاتھ پر ہاتھ مارتے۔ ٹھٹا مارتے اور دور بھاگ جاتے اشرف خان کی بھینسیں اسٹیشن کے دوسری طرف لائنوں کے پار ہری ہری گھاس چر رہی تھیں اور اشرف خان اسٹیشن پر ممو بھیا سے ہنسی مذاق دل لگی کر رہے تھے۔

"اشرف خان تمہارا گاؤں کتنی دور ہے؟" میں نے پوچھا

اشرف خان نے دور ہی سے جواب دیا "وہ پہاڑ کے نیچے یہاں سے ایک میل ہوگا۔ راستے میں بڑا نالا پڑتا ہے — ہم یہاں روز بھینسیں چرانے آتا ہے"

اشرف خان کا گاؤں کالے کالے اونچے پہاڑوں کے دامن

Marfat.com

میں بڑے نالے کے کنارے لیا تھا۔ اشرف خان شام کو گھر جاتے ہیں۔ پھوس کا چھوٹا سا گھر ہے ان کی ماں بھینسوں کا دودھ دوہتی ہے ـــــ ہتھ روٹی پکاتی ہے ـــ رات کو یہ چھوٹا سا کنبہ چھولے کی دال اور جو کچھ بھی میسّر آتا ہے کھا کر سو رہتا ہے۔ صبح کو اشرف خان دودھ اور چاچھ پیتے ہیں۔ بڑا مزا آتا ہے۔

گاڑی آنے والی تھی۔ اٹک کے ٹکٹ خریدے۔ گاڑی کینیانوں میں (CANYONS) جارہی تھی۔ پہاڑ ہم سے کافی دور تھے۔ ہمیں ان کینیانوں میں گپھائیں اور غار بھی نظر آئے۔ جن میں آدمی رہتے تھے گپھاؤں اور غاروں کو صاف کر کے اور ان میں دروازے لگا کر رہائش کے قابل بنا لیا تھا۔

جو انسان لندن اور نیویارک کے اسکائی اسکریپر اسٹیٹ ایمپائر بلڈنگ اور والڈروف آسٹوریا ہوٹل میں رہتا ہے اور جس کو یہ دعویٰ ہے کہ وہ اس دور میں سب سے زیادہ متمدن ہو گیا ہے۔ وہی انسان ـــــ ابھی تک حسن ابدال کے کینیانوں میں گپھاؤں اور غاروں میں بھی رہتا ہے۔

دھوپ پھیل پڑ چکی تھی اور تمازت باقی نہ رہی تھی۔ ہم کیمبل پور پہنچے یہاں اخبار خریدا اور تھوڑا ناشتہ کیا۔ کیمبل پور سے گاڑی چل کر اونچے اونچے پہاڑوں میں داخل ہو گئی۔ گاڑی ڈھلان پر جارہی تھی۔ پہاڑوں کی بلندی اور زیادہ ہوتی جارہی تھی۔ معلوم ہوتا تھا کہ گاڑی کسی گہرے

Marfat.com

غار میں گھستی چلی جارہی ہے۔ آخر گاڑی پہاڑوں کے درمیان ایک چھوٹے سے اسٹیشن پر رُکی۔

## اٹک

ہم گاڑی سے اُتر گئے اندھیرا چھا گیا تھا۔ چاروں طرف اونچے اونچے پہاڑ۔ پتھروں سے ٹکرا کر بہتے ہوئے پانی کا شور۔ خاموش چھوٹا سا اسٹیشن۔ گاڑی کے چلے جانے کے بعد جو کچھ چہل پہل تھی وہ بھی ختم ہو گئی۔ بابو صاحبان بھی اسٹیشن کے اندر چلے گئے۔ عجیب ہیبت ناک منظر تھا۔ ہم اسٹیشن کے باہر کھانے کی تلاش میں گئے۔ اسٹیشن کے باہر کچھ دور پہاڑ کی ڈھال پر ایک پھوس کا ہوٹل تھا اور لالٹین کی مدھم روشنی۔

۔۔۔۔ ہم نے پوچھا "کچھ کھانے کو ہے؟؟"

"ہاں صاحب! تلا ہوا مچھلی اور تنوری روٹی ہے۔"

ہم نے تلی ہوئی مچھلی اور تنوری روٹی کچی پیاز کے ساتھ کچر کچر خوب کھائی۔ پیاز بڑی میٹھی تھی۔ اتنی میٹھی پیاز میں نے کبھی نہیں کھائی تھی

ہم کھانا کھا کر اسٹیشن آئے۔ سوال یہ تھا کہ سویا کہاں جائے؟؟ مموبھیا کی رائے تھی کہ یہیں پلیٹ فارم پر ہی بستر کھول دیئے جائیں میرا خیال تھا کہ اسٹیشن سے ہٹ کر سویا جائے۔ کیونکہ خاص لائن (MAINLINE) ہے رات بھر گاڑیاں گذریں گی۔ ان کے شور سے ہم سو نہ سکیں گے۔ بہرحال کافی سوچ بچار کے بعد پلیٹ فارم پر بستر

Marfat.com

کھول دیئے۔ گرمی کافی تھی ہوا بھی بند تھی رات میں درجہ حرارت بڑھ جانے کی وجہ سے طوفانِ باد آ گیا۔ پہاڑوں کے درمیان ہونے کی وجہ سے کافی تیز اور زوردار تھا۔ مگر ہم لوگ صبح تک چادر تانے پڑے رہے

صبح ہوٹل میں ناشتہ کرنے گئے۔ ہمارا پروگرام تھا کہ اٹک میں تیل کے چشمے OILFIELDS بھی دیکھیں گے مگر معلوم ہوا کہ تیل کے چشمے یہاں نہیں ہیں بلکہ کالا باغ میں ہیں اور کالا باغ جانے کے لئے کیمبل پور سے گاڑی تبدیل کرنا پڑتی ہے۔ اس لئے اب ہمیں صرف اٹک کا قلعہ دیکھنا تھا۔

دریا کے اُس پار سرحد کا علاقہ شروع ہو جاتا تھا۔ چاروں طرف اونچے اونچے پہاڑوں پر راستے بنے ہوئے تھے اور کہیں کہیں پہاڑوں پر پُل کی حفاظت کے لئے مورچے بھی بنے تھے۔ ہمارے سامنے پولیس کا ایک محافظ دستہ پریڈ کر رہا تھا۔ پل کی حفاظت حکومت سرحد کے ذمے تھی،

ناشتہ تیار ہونے میں دیر تھی۔ اس لئے ہم باتیں کرنے لگے اسٹیشن کا پانی پلانے والا لکھنؤ کا تھا۔ اتنے میں اسٹیشن ماسٹر صاحب بھی آ گئے۔ علیک سلیک ہوئی۔ پوچھنے لگے "آپ لوگ کہاں سے آئے ہیں؟" ہم نے بتایا "کراچی سے سیر و تفریح کے لئے"

"تو پھر آپ قلعہ بغیر اجازت نہیں دیکھ سکتے" پھر خود ہی بولے "ہاں ایک ترکیب ہے بکنگ بابو اگر راضی ہو جائیں تو وہ دکھا سکتے

Marfat.com

ہیں، وہاں ان کے ملاقاتی ہیں "

ہم نے کہا "اس سے بہتر ترکیب کیا ہو سکتی ہے ؟ آپ بکنگ بابو سے کہہ دیجئے۔ بڑی عنایت ہوگی ۔۔۔!"

وہ اچھا، کہہ کر چلے گئے۔ ہم نے ناشتہ کیا۔ سامان اسٹیشن میں رکھ دیا اور پانی والے کے ساتھ بکنگ بابو کے کوارٹر پہنچے۔ پانی والے نے آواز لگائی "بکنگ بابو" ۔۔۔؟

دُبلے پتلے، لمبے تڑنگے۔ نوجوان ہنس مکھ۔ ایک شریف سے پنجابی بابو۔ پجامہ اور بنیان پہنے۔ مسواک کرتے ہوئے باہر نکلے علیک سلیک کے بعد صورت حال بتائی کہنے لگے "میں ہر خدمت کے لئے حاضر ہوں۔ میں نے بھی اب تک کلاہیں دیکھا ہے۔ وہاں جاں پہچان تو ضرور ہے۔ اچھا۔! گاڑی چلی جائے تو پھر چلئے۔ پشاور سے گاڑی آنے والی تھی۔ اس کے ٹکٹ بانٹنا تھے۔ کہنے لگے "آپ اتنی دیر پُل وغیرہ کی سیر کر لیجئے" گاڑی آنے میں ڈیڑھ گھنٹہ تھا ہم پل پہ چلے گئے۔

پل اسٹیشن سے پندرہ بیس قدم چلنے کے بعد ہی شروع ہو جاتا ہے پل کے دو حصے ہیں اوپر سے ریل گذرتی ہے اور نیچے سے ٹریفک۔ سارا پل لوہے کا بنا ہوا ہے کھمبے بے ترتیب بنے ہیں اس بے ترتیبی کی وجہ پانی کا بہاؤ ہے۔ جہاں پانی کا بہاؤ زیادہ ہے وہاں زیادہ مضبوط موٹے اور قریب قریب کھمبے بنائے ہیں۔ پل کے درمیاں میں کوئی

Marfat.com

ایسی ترکیب رکھی ہے کہ کھمبوں کو اگر کوئی نقصان پہنچ جائے تو پل کو زیادہ نقصان نہ پہنچ سکے۔

ہم پل پر جا رہے تھے۔ نیچے دریا شور مچاتا چٹانوں سے ٹکراتا بہا جا رہا تھا۔ دریا آگے جا کر ایک بہت بڑی چٹان سے ٹکرا کر دو حصوں میں تقسیم ہو گیا تھا اور پھر چٹان سے آگے چلنے کے بعد آپس میں مل کر پہاڑوں میں۔ دور نہ جانے کہاں غائب ہو گیا تھا۔

میں ہندوستان کا نقشہ بناتے وقت پلیسل کی ایک لکیر بناتا ہوں، جو تبت میں مانسرور جھیل کے قریب سے چلتی ہے لداخ اور کشمیر پر سے گذرتی ہوئی صوبہ سرحد میں داخل ہو جاتی ہے پھر اٹک سے گذر کر پنجاب اور صوبہ سرحد کی حد بناتی ہوئی سندھ میں داخل ہو جاتی ہے سکھر اور حیدر آباد (سندھ) سے گذر کر بحرہ عرب کے ساحل پر ختم ہو جاتی ہے۔ یہ لکیر میں دو تین منٹ میں بنا لیتا ہوں۔ آج میں اس پل پر کھڑے ہو کر اس لکیر کی اہمیت اس کا بہاؤ۔ اس کا زور اس کا شور دیکھ رہا تھا۔ وہ دریا جو سکھر میں ایک میل چوڑا تھا وہ یہاں ڈیڑھ دو فرلانگ سے زیادہ چوڑا نہ ہوگا۔ دونوں طرف اونچے اونچے پہاڑ تھے۔ اور تہہ میں چٹانیں۔ بڑے خوفناک طریقے سے دونوں پہاڑوں میں پانی دب کر اور چٹانوں سے ٹکرا کر بہہ رہا تھا۔ اتنا تیز بہاؤ میں نے کسی دریا میں نہیں دیکھا۔ ہم پل کے دوسرے سرے تک گئے اور صوبہ سرحد میں داخل ہو کر واپس ہو گئے کیوں کہ ہمیں نیچے دریا پر جا کر نہانا تھا۔

Marfat.com

ہم ایک پگڈنڈی پر جو گدھوں کے آنے جانے کے لئے بنائی گئی تھی چٹانوں میں سے ہوتے ہوئے پانی تک پہنچے۔ ریت نہایت باریک صاف اور چمکدار تھی۔ اس ریت کا ٹھیکہ تھا یہاں سے گدھوں پر لاد کر اسٹیشن جا رہی تھی پھر ریل کے ذریعے مغلپورہ ورک شاپ جاتی تھی جہاں اس ریت سے پرزے صاف کئے جاتے ہیں۔ دو مزدور ریت کھود کھود کر گدھوں پر لاد رہے تھے۔

ہم ایک چٹان پر بیٹھ گئے اور پانی کے بہاؤ کا تماشہ دیکھتے رہے اور یہ سوچتے رہے کہ کہاں نہایا جائے۔ کیوں کہ کنارے پر پاؤں رکھنے سے ریت دھنستی تھی اور خوف تھا کہ کہیں بہت زیادہ نہ دھنس جائے پھر پانی کا بہاؤ بھی بہت تیز تھا۔ ایک ترکیب سمجھ میں آئی۔ پانی کی قوت کم کرنے کے لئے پل کے قریب دو دیواریں بنی تھیں۔ ان دیواروں کی آڑ میں پانی بھی کم تھا اور بہاؤ بھی۔ ہم ایک دیوار کے سہارے نہانے لگے۔ ہمالیہ کی برف سے ڈھکی ہوئی چوٹیوں کا سرد پانی ـــــ میں تو دو تین غوطے مار کر جلدی سے بھاگا۔ فوراً کپڑے پہنے۔ ہم پھر ایک چٹان پر دھوپ لینے بیٹھ گئے اور دریا کے بہاؤ کا تماشہ دیکھتے رہے۔ اتنے میں گاڑی آئی اور پل سے گذر گئی۔

گاڑی گذر جانے کے بعد ہم اسٹیشن پہنچے۔ گاڑی جا چکی تھی اور بکنگ بابو اپنے کام سے فراغت پا چکے تھے۔ ہم نے ایک تانگہ کیا بکنگ بابو کے صاحبزادے بھی ہمارے ساتھ ہو گئے۔ قلعہ پہاڑ کی پشت پر

Marfat.com

تھا۔ ہم شاہ راہ اعظم پر جا رہے تھے سڑک پہاڑ کے دامن میں لپٹی بل کھاتی جا رہی تھی اور نیچے بہت گہرے خوفناک کھڈ میں دریا بہہ رہا تھا

ہمیں دو میل جانا تھا ایک تو چڑھائی تھی پھر گھوڑا مریل تھا۔ تانگے والا چابک پر چابک مارتا مگر گھوڑے کی چال میں کوئی فرق نہ آتا تھا۔ خدا خدا کر کے ہم قصبہ اٹک کے قریب پہنچے۔ سامنے قلعہ نظر آ رہا تھا۔ قصبہ پہاڑ کی ڈھال پر دریا کے کنارے تک بسا ہوا تھا۔ ہم قلعے کے دروازے پر جا کر رک گئے۔ بکنگ بابو دروازے میں گئے تاکہ اپنے ملاقاتی کا پتہ لگائیں۔ تھوڑی دیر بعد وہ واپس آئے اور ہم سب ان کے ساتھ ہو گئے ایک چکر دار راستے سے گذر کر ہم ایک چھاؤنی میں داخل ہوئے یہاں کچھ آدمی ملے جو بکنگ بابو کو جانتے تھے۔ مگر ان میں قلعہ دار صاحب بکنگ بابو کے خاص دوست موجود نہ تھے۔ انہیں ایک آدمی بلانے گیا ہوا تھا۔ قلعہ دار صاحب آئے بڑے تپاک اور میٹھی مسکراہٹ کے ساتھ بڑی گرمجوشی سے ملے۔ ہم ان کے ساتھ قلعے میں داخل ہو گئے۔

سارا قلعہ خالی پڑا تھا۔ یہاں آزاد ہند فوج کے سپاہی بھی قید رہے تھے۔ اور مسلم لیگ کے وہ لیڈر بھی جنہوں نے خضر حیات کی حکومت کے خلاف سول نافرمانی کی تھی۔

قلعہ پہاڑ کی ڈھلوان پر دریا کے کنارے تک بنا ہے قلعے کی آخری دیوار سے دریا کی موجیں ٹکراتی ہیں قلعے کے دو حصے ہیں جو اونچا ہے۔ وہ بالا قلعہ کہلاتا ہے اور نچلے حصے کا کوئی خاص نام نہیں ہے۔ بالا قلعے میں

Marfat.com

انگریزی عہد کی تعمیر زیادہ ہے ۔ بارکس، اسپتال ۔ اسٹور وغیرہ نچلے حصے میں زیادہ تر تہہ خانے بنے ہیں ۔

ہم پہلا حصہ دیکھ کر اور ایک پھاٹک سے گذر کر نچلے حصے میں پہنچے راستے پر اونچی اونچی گھاس تھی ۔ کہیں کہیں راستہ صاف کر دیا گیا تھا ایک طرف پھوس کے چھپر پڑے تھے ۔ جن میں آزاد ہند فوج کے سپاہی اور مسلم لیگ کے لیڈر رہ چکے تھے ۔

ہم مختلف راستوں اور پھاٹکوں سے گذر کر قلعے کی آخری دیوار پر چڑھ گئے ۔ دریا کی موجیں دیوار سے ٹکرا رہی تھیں ۔ سامنے دوسرے کنار پر خیر آباد کا قصبہ تھا قصبے کے اوپر پہاڑ کے دامن میں شیر شاہ سوری کے زمانے کی سڑک پر ایک نالے کا پُل تھا ۔ اور یہ پل ہماری گفتگو کا موضوع تھا ۔

نئی سڑک بناتے وقت نالے کا پل بنایا گیا ہے پُرانا پل اب صرف آثار قدیمہ کی حیثیت سے باقی رہ گیا ہے ۔ نالا دریا میں آکر مل جاتا ہے نالے سے تھوڑے فاصلے پر ایک اور دریا دریائے سندھ میں ملتا ہے یہ دریائے کابل ہے ۔

" وہ ۔ نالے کے اس طرف لُونڈا دریا ہے اور سامنے خیر آباد ہے،" قلعہ دار صاحب ہمیں بتا رہے تھے ۔ آگے دریائے سندھ بہت چوڑا ہو گیا تھا ۔ دور تک سفید ریت پھیلی ہوئی تھی جو دھوپ میں چمک رہی تھی

---

ما ۔ اٹک میں دریائے کابل کو لونڈا اور دریائے سندھ کو دریائے اٹک کہتے ہیں ۔

Marfat.com

بیچ دریا میں ایک ترچھا کھمبا ہزاروں برس سے موجوں کے تھپیڑے سہہ رہا تھا کسی زمانے میں یہاں پل رہا ہوگا۔ یہ کھمبا اس پل کا باقی رہ گیا تھا۔ سکندر سے لے کر بعد کے ہزاروں بادشاہوں نے کشتیوں کا پل باندھا ہوگا اور معلوم نہیں کن کن طریقوں سے دریا کو عبور کرنے کی کوشش کی ہوگی۔

ہم ایک تہہ خانے میں اُترے یہاں قیدیوں کے بند کرنے کی کوٹھریاں بنی ہوئی تھیں ان کوٹھریوں میں نہ جانے کتنی چیخیں۔ کتنی سانسیں آزادی کی تمنا میں گھٹ گھٹ کر اور سر پٹخ پٹخ کر رہ گئی ہوں گی۔ ہم ایک سُرنگ میں ہو کر دوسرے تہہ خانے میں پہنچے۔ یہ تہہ خانہ لکھنؤ زینت محل کے تہہ خانے سے بہت کچھ ملتا جلتا تھا۔ یہاں ایسے کئی تہہ خانے تھے۔ جس میں ہم نہ جا سکے اور اگر جاتے تو بہت ممکن تھا کہ پھر واپس نہ لوٹتے۔ یہ سب تہہ خانے بیگمات کے رہنے کے لئے تھے۔

ہم انگریزی عہد کے ایک تعمیر شدہ بُرج پر چڑھ گئے۔ یہاں سے منظر اور بھی اچھا دکھائی دیتا ہے۔ قلعے کی دیوار کے نیچے اس سڑک کے آثار بھی معلوم ہوتے تھے۔ جو شیر شاہ سوری کے زمانے میں دریا کو پار کرتی تھی۔ اور اب یہ بیکار پڑی تھی۔ کیوں کہ موجودہ سڑک دوسرے راستے سے بنا کر پل تک لے گئے تھے۔ جس پر ہم چل کر آئے تھے۔ دریا کے کنارے ایک مزار اور مسجد بھی بنی تھی۔

ہم ایک ایسی جگہ پہنچے جہاں دربار لگتا ہوگا۔ اصل عمارت تہہ خانے میں تھی۔ جس کا دروازہ اب بند کر دیا گیا تھا۔ ہم اس عمارت کی چھت پر کھڑے

Marfat.com

تھے یہاں "جلال الدین محمد اکبر بادشاہ ہندوستان" کے نام کا سفید پتھر لگا ہوا تھا۔ سنہ بھی لکھا تھا۔ جو مجھے یاد نہیں رہا۔

ہم کافی عرصے تک اپنے آباؤ اجداد کے کھنڈرات میں ان کی نشانیاں ان کے آثار ان کے نقوش قدم تلاش کرتے رہے۔

ہو چکا گو قوم کی شانِ جلالی کا ظہور
ہے ابھی باقی مگر شانِ جمالی کا ظہور

قلعہ دار صاحب مضر تھے کہ ہم لوگ چائے پی کر جائیں اور ہم لوگوں کو ایک بجے پسنجر گاڑی پشاور کے لئے لینا تھی۔ بڑی حجت کے بعد اجازت ملی اور ہم اسی مریل گھوڑے کے تانگے پر روانہ ہوئے وقت بہت کم رہ گیا تھا گھوڑا اپنی اسی چال سے چلتا رہا بمشکل ہم اسٹیشن پہنچے گاڑی کھڑی تھی بکنگ بابو اپنا کام اپنے ایک ساتھی کو سونپ آئے تھے۔ اس لئے انہیں اطمینان تھا ہم بھاگے ہوئے گئے اور سامان اٹھا کر سامنے والے ڈبے میں ڈالنا شروع کر دیا بکنگ بابو نے فوراً ٹکٹ بنا دیئے۔ ہم گاڑی میں سوار ہوئے مصافحہ کیا، سلام کیا گاڑی چل دی۔

گاڑی پل سے گذر کر اب صوبہ سرحد میں داخل ہو چکی تھی اور کئی چھوٹی بڑی سرنگوں سے نکل کر ایک ایسے مقام پر پہنچی جہاں سے قلعہ۔ دریائے سندھ سامنے کے پہاڑ اور دریائے کابل صاف دکھائی دیتے تھے گاڑی دریائے کابل کی وادی میں جا رہی تھی اور دریائے کابل ہمارے ساتھ کبھی دور کبھی نزدیک بہہ رہا تھا۔ پشاور اور نوشہرہ دریائے کابل کی وادی ہی میں آباد ہیں۔ یہ وادی

Marfat.com

کافی سرسبز اور زرخیز ہے۔ جہاں جہاں نہریں جا سکی ہیں۔ وہ حصے چمن معلوم ہوتے ہیں۔ زیادہ تر پھلوں کے باغ لگائے ہیں۔ گاڑی "اکوڑہ خٹک" پر رُکی "کابلی چنے"، "کابلی چنے"۔ ہم لوگ بھوکے تھے۔ اُبلے ہوئے نمکین چنوں نے بڑا مزا دیا۔

کہتے ہیں کابل میں گدھے نہیں ہوتے ۔ ؟ کابل میں گدھے ہوتے ہیں یا نہیں ۔ اس سے بحث نہیں۔ چنے ضرور ہوتے ہیں جو ایسی بھوک میں بڑا مزا دیتے ہیں۔ خوشحال خان خٹک بھی یہی کابلی چنے کھا کھا کر اشعار کہتے ہوں گے جب ہی تو ان کے اشعار میں ہمت۔ شجاعت آزادی اور جواں مردی کے جذبات کوٹ کوٹ کر بھرے ہوئے ہیں۔

سرحد کا یہ آزاد اور جواں مرد، غیور اور دلیر فرزند اسی خاک سے پیدا ہوا تھا۔ اپنے وطن عزیز کی خاطر مغلوں سے آخیر دم تک لڑتا رہا۔ اُس نے شاعری کے ذریعے اپنی قوم کو آزادی کا جو پیغام دیا تھا اسے آج بھی پٹھانوں کا بچہ بچہ اپنی متاع عزیز کی طرح سینے سے لگائے پھرتا ہے۔ چھاتی تان کر بڑے فخر سے سر اٹھا کر پہاڑوں کی چوٹیوں پر سخت چٹانوں پر اپنی مخصوص طرز میں اہک لہک کر گاتا ہے۔

دریائے کابل ہمارے ساتھ برابر بہتا آرہا تھا۔ نوشہرہ آیا اور نکل گیا ایک چھوٹے سے اسٹیشن پر گاڑی ٹھہری۔ گاؤں کے بچے ٹوکریوں میں تازیں بیچ رہے تھے۔ ایک ٹوکری چار آنے میں ..... نہایت غریب مفلوک الحال میلے کچیلے چیتھڑوں سے بدن ڈھانکے۔ تن درست سُرخ و سفید بچے آواز لگا

Marfat.com

رہے تھے۔ اور افلاس اُن کی صحت مندی کا مذاق اُڑا رہا تھا۔ ان کی غربت کا یہ عالم تھا کہ دو تین ہی پیسے دے دینے سے وہ اپنا سارا مال دینے پر راضی ہو جاتے تھے ہم نے بھی تھوڑی سی تاحیں خرید لیں اور پشاور تک کھاتے ہوئے گئے۔

ہمارے ساتھ ایبٹ آباد کے ایک کلرک بیٹھے ہوئے تھے۔ میں ان سے باتیں کرنے لگا۔ انہوں نے بتایا کہ درہ خیبر دیکھنے کے لئے پولیٹکل ایجنٹ سے اجازت لینا پڑے گی۔ یہ بات میں ٹائم ٹیبل میں بھی دیکھ چکا تھا۔ ہدایت درج تھی "درۂ خیبر کے سیاحوں کے لئے پولیٹکل ایجنٹ، خیبر ایجنسی، مقیم پشاور چھاؤنی سے اجازت نامہ حاصل کرنا پڑے گا۔"

ان سے زبان پر گفتگو ہونے لگی۔ میں نے پوچھا "ایبٹ آباد کی طرف کون سے زبان بولی جاتی ہے؟ پشتو یا پنجابی؟ یا پھر دونوں کی ملی جلی ایک تیسری شکل ہے؟" وہ صوبہ پنجاب اور صوبہ سرحد کا سرحدی علاقہ ہے دو زبانیں ملتی ہیں۔ "ہاں کچھ ایسا ہی ہے" وہ کہنے لگے شاید آپ کو زبان کے معاملے میں تکلیف ہو"۔ میں نے کہا "ہم ایسی زبان بولتے ہیں جسے سب سمجھ لیتے ہیں ہر جگہ سمجھی اور بولی جاتی ہے"

پشاور قریب آ رہا تھا۔ باغات اور نہریں آنا شروع ہو گئی تھیں ہمیں پشاور چھاؤنی اترنا تھا۔ پشاور سٹی آیا اور چلا گیا ایک معمولی سے بلے اور پرسکون پلیٹ فارم پر گاڑی کھڑی ہو گئی۔

Marfat.com

# اٹک پار

## پشاور کینٹ

ہمارا ہوٹل کراچی کے فریڈرک کا فیٹیریا۔ یا کیفے جارج سے کسی طرح کم نہ تھا۔ کافی لمبا چوڑا لونج (LOUNGE) تھا۔ ٹیلیفون۔ برقی پنکھے اور نہایت آرام دہ صوفہ طرز کی میز کرسیوں سے آراستہ تھا۔ ہم خوب نہائے۔ کپڑے تبدیل کئے اور تفریح کی غرض سے نکلے پہلے ایک حجام کی دوکان میں خط بنوانے گئے۔

حجام کلکتہ بمبئی وغیرہ پھرے ہوئے تھا۔ موٹا تازہ۔ لمبی لمبی مونچھوں والا شخص تھا۔ ہمیں اجنبی جان کر پوچھنے لگا "یہاں کیسے آئے"

ہم نے مقصد بیان کیا تو خود ہی کہنے لگا "یہاں سیر کرنے آپ کیا آئے ہیں۔؟ یہاں کے لوگ بڑے جنگلی اور وحشی ہوتے ہیں۔ درندے ہیں درندے!! اپنے تایا کے بیٹے کو بھی ذبح کر ڈالتے ہیں۔ جس کو آپ لوگ چچا کا بیٹا کہتے ہو" جانے کب کا یہ پکا ہوا پھوڑا تھا۔ جو آج پھوٹ گیا تھا۔ خدا معلوم یہ بنت عم سے معاشقے کا کوئی قصہ تھا۔ زمین کھیتی باڑی یا سرمایہ کا کوئی جھگڑا تھا۔ جس کی شکایت تھی۔

ممو بھیا نے اپنے مخصوص انداز میں پوچھا "خاں صاحب کیا بات ہوئی"

"اجی کچھ نہ پوچھئے"، اور آواز فرطِ غم سے لڑکھڑا گئی۔

ہم صدر روڈ پر پھرتے ہوئے مال روڈ پہنچ گئے۔ سڑک کے دونوں طرف پھولوں کی بیلیں لدی ہوئی تھیں اور ان بیلوں میں بنگلے چھپے ہوئے تھے

Marfat.com

یہ سڑک بڑی پُرسکون، خاموش، شور غل سے بہت دور تھی۔ ایک سینما کے قریب سے گذرے تو موچیا مصر ہو گئے کہ سینما ضرور دیکھیں گے۔ ہم سفر کی وجہ سے کافی تھک گئے تھے نیند بھی پوری نہیں ہوئی تھی۔ اس لیے میں سینما دیکھنا نہیں چاہتا تھا۔ مگر موچیا نہ مانے۔ ہم ہوٹل آئے اور کھانا منگا۔

ہمارے سامنے کھانوں کی فہرست رکھ دی گئی ہم نے کچھ کھانے منتخب کر دیئے۔ ان کھانوں میں ایک "تکا کباب" بھی تھا۔ لفظ تکا، سن کر مجھے ہنسی آتی تھی۔ کیا معلوم تھا کہ پشاور میں "تکا" ایک مشہور کباب ہو گا یہ کباب چھوٹے جانور کے نہایت نرم گوشت سے تیار کئے جاتے ہیں۔ دراصل یہ ایک طرح کی کڑھائی یا فرائی پان میں بھنی ہوئی ادھ کچی بوٹیاں ہوتی ہیں۔ جنہیں ہڈیوں سمیت بھونا جاتا ہے۔

کھانا کھا کر سینما چلدیئے۔ سینما کی عمارت بڑی خوبصورت تھی نقش و نگار سے ہندوانہ طرز جھلکتا تھا۔ کھیل دلچسپ اور اچھا تھا۔ اگر تھکے ہوئے نہ ہوتے اور نیند میں جھونکے نہ کھا رہے ہوتے تو کافی لطف اندوز ہوتے۔

آج ہمیں پولٹیکل ایجنٹ کے دفتر سے درہ خیبر کا پاس لانا تھا۔ ناشتہ کر کے ایجنٹ کے دفتر روانہ ہو گئے۔ ہم اخبار خیبر میل KHAYBAR MAIL کے دفتر کے سامنے سے گذرے چھوٹا سا دفتر تھا دفتر ہی میں کمپوزیٹر روم اور پریس بھی تھا۔ میں نے تازہ پرچہ لیا اور چلا آیا۔ ہم پوچھتے پوچھتے پولٹیکل ایجنٹ کے دفتر پہنچے پہرے دار کو ایک لمبا تڑنگا سلام کھینچ مارا "خان صاحب ہم پولٹیکل ایجنٹ سے ملنا چاہتے ہیں۔" "کیوں ملنا چاہتا

Marfat.com

ہے"؟ ایک مسکراہٹ آلودھاری بھرکم آواز نے ہم سے پوچھا۔ہم نے بتایا کہ ہیں پاس بنوانا ہے تو خان صاحب کہنے لگے وہ تو ہے تہیں پاس بنوانے کے لئے دفتر میں جاؤ۔ دفتر سزیب ہی تھا۔ایک دبلے پتلے چھریرے بدن کے ہنس مکھ کلرک سے ملاقات ہوئی انہوں نے ہیں ایجنٹ کے پرسنل اسسٹنٹ (P.A) کے پاس بھیج دیا۔

لارے لپّا...... لارے لپّا...... لارے

کوئی صاحب اندر موٹی آواز میں بڑے ترنم سے گا رہے تھے اور ٹائپ کی وپھٹ' ر پھٹ، ساز کا کام دے رہی تھی۔ ہم پی۔اے (P.A) صاحب کے پاس پہنچے۔صاحب سلامت ہوئی۔صاحب موصوف بڑے خوش اخلاق شگفتہ مزاج، سادا اور بے تکلف تھے۔ہم سے بڑی ہمدردی اور انکساری سے پیش آئے اردو اچھی بولتے تھے اور شعروشاعری سے بھی دلچسپی تھی۔پاس کے مطالبے پر کہنے لگے "مجھے بڑا افسوس ہے ۔۔ ایجنٹ اور اس کا نائب دونوں لنڈی کوتل ہیں اور یہ کام انہیں کی مرضی پر منحصر ہے ۔ اگر آپ پہلے سے ہمیں لکھ دیتے تو ہم پاس تیار رکھتے آپ کو آتے ہی مل جاتا ۔۔ ٹھیرو! میں لنڈی کوتل ٹیلیفون کرتا ہوں اگر اجازت دے دی تو بہت اچھا ہے ورنہ معافی چاہتا ہوں ۔۔ جب انگریز تھا تو وہ اپنی ڈیوٹی سمجھ کر اجازت دے دیتا تھا۔کسی کا فائدہ ہو جائے تو کیا بُرا ہے ۔ مگر اب ۔۔ ایسا ہی حساب ہے ۔۔"، لنڈی کوتل کا نمبر لے کر کافی دیر تک پشتو میں کسی سے بات کرتے رہے معلوم ہوتا تھا کہ ٹیلیفون پر پہاڑ کے پتھر لڑھک رہے ہیں یا باتیں تو

Marfat.com

ہم خاک نہ سمجھ سکے، مگر اتنا اندازہ ہوا کہ وہ کسی کلرک سے باتیں کر رہے ہیں۔

"لارے لپّا" کی دھن میں ٹائپسٹ صاحب برابر نغمہ سرا تھے۔ معلوم ہوا بڑے مسخرے اور دلچسپ ہیں دفتر میں سب ان سے مذاق کرتے ہیں، اور یہ کسی کو خاطر میں نہیں لاتے۔

بڑی دیر کے بعد جواب آیا ہمیں اجازت مل گئی۔ انہوں نے خود ہی پاس بنا دیا۔ ہم شکریہ ادا کر کے چلے آئے۔ پاس میں مندرجہ ذیل ہدایات انگریزی میں درج تھیں۔

(۱) سوائے مخصوص اجازت کے کیمرہ ساتھ نہیں لے جا سکے۔

(۲) جمرود پر ایک روپیہ فی کس ٹال ٹکس دینا ہوگا۔

(۳) اسی دن واپس لوٹ آنا پڑے گا رات میں رہنے کی اجازت نہیں ہے

(۴) خواتین بغیر مسلح محافظ دستے کے نہ جائیں۔

ہمیں یہ سفر بس سے کرنا تھا۔ ریل لنڈی کوتل تک چلتی ہے صرف ایک دن جا کر اسی دن واپس آجاتی تھی۔ جس دن ریل جاتی تھی۔ وہ دن ابھی دور تھا اور ہم پشاور میں زیادہ ٹھہرنا نہیں چاہتے تھے۔ اس کے علاوہ ریل صرف لنڈی کوتل تک جاتی تھی۔ ہمیں تورخم تک جانا تھا جو افغانستان اور پاکستان کی آخری حد ہے۔ صدر ڈاک خانے آئے ہمیں معلوم ہوا تھا کہ صدر ڈاک خانے (G.P.O) سے جو بس افغانستان کی ڈاک لے کر جاتی ہے وہ تورخم تک جاتی ہے اور وہی بس افغانستان سے پاکستان اور ہندوستان

Marfat.com

آنے والی ڈاک لے کر واپس بھی آتی ہے۔ لنڈی کوتل تک برابر لیٹیں آتی جاتی تھیں مگر تورخم تک کوئی نہیں جاتی تھی۔

ہم نے ڈاک خانے میں معلومات کی اور پرانا شہر دیکھنے تانگے میں چل دیئے کافی دھوپ اور گرمی تھی۔ مگر ہم چاہتے تھے کہ جلد سے جلد آج اس پچھے ہوئے وقت میں جو کچھ ہو سکے دیکھ لیں۔

ہم جیل۔ گورنمنٹ ہاؤس اور کونسل ہاؤس کے سامنے سے گذرے سامنے قلعہ تھا۔ ہمارا تانگہ شاہراہ اعظم پر جا رہا تھا۔ ہم قلعے پہنچے قلعہ دیکھنے کی اجازت نہیں تھی۔ اس لئے قلعے کا چکر لگا کر مشہور قصہ خوانی بازار میں پہنچے یہاں حاکم نے محکوم پر گولیاں چلائی تھیں۔ یہاں محکوم کے تنے ہوئے اور ابھرے ہوئے سینے چھلنی کئے گئے تھے۔ زمین سرخ ہو گئی تھی۔ لالہ زار بن گئی تھی آزادی کی دیوی نے بھینٹ مانگی تھی۔ اُسے خاطر خواہ بھینٹ دی گئی تھی۔ روشنی کے لئے ہزاروں پروانے جل چکے تھے پھر بھی روشنی حاصل نہ ہو سکی تھی۔ بازار کافی چوڑا اور سجا ہوا تھا۔ ہم ایک دوسرے بازار میں پہنچے یہ بازار 'بٹیر بازاں' تھا۔ میں سمجھتا تھا کہ بٹیر بازی میں لکھنؤ ہی طاق ہے۔ بٹیر بازی لکھنو اور صرف نوابان لکھنؤ کا حصہ ہے مگر معلوم ہوا ہیں پشاور کے خان صاحبان . . . بھی اس مشغلے سے . . . دلچسپی رکھتے ہیں۔ دوکانوں پر پنجرے لٹکے ہوئے تھے۔ اور تیتر، بٹیر، کبوتر، بیا پدی۔ طوطا۔ مینا۔ سب اپنی اپنی بولیاں بول رہے تھے۔

بھوک اپنے شباب پر تھی ایک ہوٹل میں ڈٹ کر پلاؤ قورمہ اور

Marfat.com

تکا کباب کھائے پشاور کا پانی بڑا ہاضم تھا۔ اس لئے کسی بات کا ڈر نہ تھا

ہم اپنے ہوٹل واپس آ گئے تھوڑا آرام کر کے عصر کو پھر پرانے شہر گئے اس مرتبہ ہم ایڈورڈ کالج۔ پشاور اور پشاور میوزیم سے بھی متعارف ہوئے ہم مہابت خان کی مسجد دیکھنے گئے ایک تنگ و تاریک بازار میں بڑی شاندار اور خوبصورت مسجد بنی تھی۔

ہم منار پر چڑھنا چاہتے تھے ایک صاحب نے بتایا کہ چابی مُلّا کے پاس ہوگی۔ ملاجی نے کہا چابی متولی صاحب کے پاس ہے ہمیں ایک معقول سے مولانا ملے گئے۔ انہیں جب بتایا کہ ہم کراچی سے محض تفریح کے لئے آئے ہیں تو انہوں نے فرض سمجھتے ہوئے ملاجی سے دوبارہ چابی کا مطالبہ کیا انہیں شک تھا ملّاجی چار سو بیس نہ کر رہے ہوں۔ اور حقیقت میں ملاجی کے پاس چابی نہیں تھی۔

مسجد میں ایک کنواں بھی تھا ایک صاحب تانے تانے کوزوں میں کنویں سے پانی کھینچ کر بھر رہے تھے۔ مولانا کہتے لگے پانی پی کر دیکھئے اتنا ٹھنڈا اور میٹھا پانی کہیں نہ پیا ہوگا۔ ہم نے سب پوچھا پانی اتنا ٹھنڈا کیسے ہے کہتے لگے۔ جاڑے کے زمانے میں کنویں میں برف بھر دیتے ہیں پھر گرمی بھر پانی ٹھنڈا رہتا ہے۔ ہم نے مولانا کو بتایا کہ کل ہم درہ خیبر دیکھنے جا رہے ہیں۔ کہنے لگے "ضرور جایئے کسی بات کی فکر نہ کیجئے گا۔ کسی سے مت ڈریئے گا۔ کوئی خطرہ اور خوف نہیں ہے۔ لنڈی کوتل ایک دو دن ٹھہریئے گا۔ پہاڑ کے نیچے سرائے ہے۔ خوب گوشت کھایئے گا۔

Marfat.com

ــ بڑا اچھا بھنا ہوا گوشت ملتا ہے" پھر کہنے لگے "آپ لوگ پٹھانوں سے بہت ڈرتے ہیں ــ آپ کو بالکل غلط بتایا گیا ہے ــ ہمارے خلاف انگریز کا پروپیگنڈہ بڑا کامیاب تھا"

ہم نے کہا "ہمیں تو یہی معلوم تھا کہ درہ خیبر میں جو جاتا ہے لوٹ لیا جاتا ہے"

"ہاں"! مولانا کہنے لگے "اس پروپیگنڈے کا اثر جاتے جاتے جائے گا ــ ارے صاحب! وہ تو بڑے مہمان نواز اور خاطر کرنے والے لوگ ہیں ــ اگرچہ وہ آزاد علاقہ ہے مگر ــ آپ بالکل مت ڈریئے گا۔ کوئی آپ کو اپنے گھر لے جائے تو پھر اس کی خاطر دیکھئے گا ــ!! آپ ٹھہرے کہاں ہیں ــ؟؟ ہم نے بتایا کہ ہوٹل میں ٹھہرے ہیں۔ پھر تو مولانا سر ہو گئے "میرے یہاں چلیے ــ ہوٹل میں کیا ٹھہرے ہیں۔ ؟؟ آپ کہیں گے پشاور میں کسی نے خاطر بھی نہ کی ــ!! ہم نے شکریہ ادا کیا۔ پھر بھی مولانا کہنے لگے۔ اگر آپ کو ہوٹل میں کسی قسم کی تکلیف ہو تو میرے یہاں بلاتکلف چلے آیئے گا اور اپنا ہی گھر سمجھئے گا۔

ہم تانگے پر ہوٹل آرہے تھے تانگے والا ہمیں بتانے لگا "یہ ہسپتال ہے ــ وہ لڑکوں کا اسکول ہے ــ وہ سامنے جو ہے اس اسکول میں لڑکی لوگ پڑھتا ہے ــ اندر جانے کیا کیا کرتا ہے؟ ــ اندر ڈانس ڈانس کرتا ہے ــ اور باہر ایسے (منہ پر ہاتھ پھیر کر) خواہ مخواہ کو نقاب ڈالتا ہے"۔ پوچھنے لگا "آپ لوگ کہاں کا باشندہ ہے ــ؟؟"

Marfat.com

میں نے بتایا۔ "لکھنؤ ۔۔"

"لکھنؤ میں تو ہم چھ مہینے رہا ہے ۔۔ اُدھر ملٹری میں پہرہ دیتا تھا ۔۔ الٰہ آباد بھی دیکھا ہے۔ جہاں، آنند بھون، ہے ۔۔ جواہر لال کا گھر ۔۔" وہ کہے جا رہا تھا۔ "جواہر لال کا بڑا دماغ ہے۔ مگر گاندھی کے برابر نہیں۔ گاندھی کا بہت بڑا دماغ تھا"

ہم نے ہوٹل میں واپس آ کر کھانا کھایا اور سو گئے۔ ہوٹل کا مالک ایک بدمزاج۔ بکی۔ نوکروں پر ہر وقت ڈانٹ ڈپٹ رکھنے والا خان تھا دن بھر نوکروں پر چلاتا رہتا تھا۔

ہم نو بجے صدر ڈاک خانے پہنچ گئے بس پرانے شہر سے اسٹیشن ہوتی ہوئی ڈاک لے کر آتی تھی بس ایک گھنٹہ لیٹ آئی معلوم ہوا کہ رات کی بارش سے ریلوے لائین کہیں سے بہہ گئی ہے۔ اس لئے ویل، ابھی تک نہیں آیا ہے۔ بہرحال ہم بس میں بیٹھے۔ بس نہایت خستہ حالت میں تھی۔ سینما کے تھرڈ کلاس کی سیٹوں کی طرح۔ پھٹی ہوئیں۔ گندی۔ میلی کچیلی گدیاں تھیں۔ بس بھی کافی پرانے ڈیزائن کی تھی۔

ملک صاحب جن کی یہ بس تھی۔ اگلی سیٹ پر ڈرائیور کے پاس بیٹھے تھے۔ ملک صاحب کے لئے یہ بس کسان کا بیل ہو گئی تھی۔ وہ چاہتے تھے کہ آخیر دم تک اس سے نفع حاصل کیا جائے اور مرمت میں ایک پائی بھی خرچ نہ ہو۔ اور جب یہ کسی ویران سڑک پہ چلتے چلتے زندگی سے تھک کر ہمت ہار دے تو اُس بڈھے اور مریل بیل کی طرح جسے کسان گدوں

کے نوچنے کے لئے چھوڑ جانا ہے چھوڑ دیں۔

ملک صاحب کافی لمبے تڑنگے۔ گورے چٹے سُرخ و سپید سردار تھے کنجی آنکھوں میں عقاب کی سی تیزی۔ پھرتی۔ جھپٹ اور چمک معلوم ہوتی تھی۔ پچاس برس کی عمر ہوگی۔ بالوں میں سپیدی بھی آچلی تھی۔ مگر زندگی سے تھکن کے آثار کوسوں دُور تھے۔ دُبلا پتلا چھریرا۔ فولاد جیسا مضبوط بدن تھا۔ چال میں ایک وقار اور سنجیدگی پائی جاتی تھی۔ بہت کم گو اور خود بین معلوم ہوتے تھے۔ گفتگو میں سردارانہ اور حاکمانہ انداز پایا جاتا تھا۔ انگریزی سے واقف تھے۔ ہم لوگوں سے جب بھی بات کرتے تھے تو انگریزی میں یا انگریزی اور اردو ملی ہوئی زبان میں بات کرتے تھے

ہمارے ساتھ سب آزاد علاقے کے لوگ تھے نوجوانوں کے پاس (۳۰۳) کے رائفل یا پستول تھے اور کارتوس کی پیٹیاں سینے پر سجی ہوئی تھیں۔ عورتوں نے برقعے اوڑھ رکھے تھے مگر نقابیں الٹی ہوئی تھیں دو بچے بھی تھے۔ جن کے پاس اردو کی کتابیں اور کاپیاں تھیں میں نے ایک بچے کے ہاتھ سے کتاب لے کر کہا "پڑھو یہ کیا لکھا ہے"

"لب پہ آتی ہے دعا بن کے تمنا میری

زندگی شمع کی صورت ہو خدایا میری"

"شاباش —!! تم تو کافی پڑھنا جانتے ہو"، چھوٹے سے خان مسکرائے شہر میں ایک بس اسٹینڈ پر ایک مولانا بس میں سوار ہوئے۔ مولانا جمرود تک جارہے تھے، مولانا کی باتوں سے ان کی معلومات اور

Marfat.com

ان کی روشن دماغی سے ہم لوگ کافی متاثر ہوئے۔ مولانا نے بھی وہی بات کہی یعنی پٹھانوں کے خلاف انگریز نے سو سال تک جو پروپیگنڈا کیا ہے۔ اس کا اثر کافی عرصے میں جائے گا۔ مولانا انگریزی کے لفظ بہت صاف ادا کرتے تھے۔

ہماری بس پشاور سول ایئرپورٹ کا چکر لگا کر اسلامیہ کالج میں داخل ہو گئی۔ یہاں کے پوسٹ آفس کو ڈاک دینا تھی۔ کالج شہر سے سات میل دور ہے اس کے دو تین میل آگے سے آزاد علاقہ، شروع ہو جاتا ہے۔ کالج کی عمارتیں علی گڑھ یونیورسٹی کی عمارتوں کی طرح ہیں مگر علی گڑھ یونیورسٹی کی طرح بے ترتیب نہیں ہیں۔ کالج کا تمام علاقہ بہت بڑا سرسبز باغ معلوم ہوتا ہے۔

مولانا نے ہمیں، جیسر ہال، ہوسٹل، کلاس روم۔ پروفیسروں کے بنگلے وغیرہ دکھائے۔ ہم کالج باقاعدہ طور سے پھر کر نہ دیکھ سکے۔ پھر بھی ہم نے کافی دیکھ لیا تھا۔ کیونکہ کالج کا پوسٹ آفس کالج کے احاطے میں تھا۔

## درۂ خیبر

ہمارے سامنے اونچے اونچے پہاڑ تھے جو قریب آتے جا رہے تھے۔ ایک نالے سے بس گذری۔ مولانا نے بتایا یہاں سے آزاد علاقہ شروع ہو جاتا ہے۔ حکومتِ ان کے معاملات میں براہ راست دخل نہیں دے سکتی بلکہ حکومت کا مقرر کردہ پولیٹیکل ایجنٹ ان کے تمام معاملات طے کرتا ہے اور اس علاقے میں اپنے ماتحت افسر اور عملہ بھی مقرر کرتا ہے

Marfat.com

ہم جمرود پہنچے۔ جمرود پہاڑ کے دامن میں درۂ خیبر کی پہلی چوکی ہے یہاں ایک چھوٹی سی پہاڑی پر سکھوں کے زمانے کا ایک قلعہ بنا تھا یہ قلعہ زیادہ تر مٹی کا بنا تھا۔ ایسے ہی مٹی کے قلعے درۂ خیبر میں اکثر جگہ دکھائی دیتے ہیں جو درحقیقت قلعے نہیں ہیں بلکہ قلعہ بند گاؤں ہیں۔

ہم سے پاس مانگا گیا پاس کے دو حصے تھے ہم نے ایک حصہ پھاڑ کر دے دیا دوسرا حصہ ہمیں واپس آکر دینا تھا۔ ایک روپیہ فی کس ٹال ٹکس بھی دیا۔ یہاں رائیل افغان میل کھڑا تھا۔ ایک افغانی سوئیڈ لوٹڈ کھڑکی کا سہارا لئے کھڑے تھے۔ ہم نے اردو میں ان سے پوچھا کابل کتنی دور ہے ۔؟ آپ کس وقت کابل پہنچ جائیں گے ۔؟ وہ ہماری بات نہ سمجھ سکے اور مسکرا کر فارسی میں کچھ کہنے لگے جو ہم نہ سمجھ سکے اور رائیل افغان میل بیتی ان کی لیں چل دی۔

ہم جمرود سے چل کر درۂ خیبر میں داخل ہو گئے تھے اور ہماری بس پہاڑ پر چکر کھاتی ہوئی چڑھ رہی تھی۔ ہمارے ساتھ ساتھ ریل کی لائین بھی جا رہی تھی۔ یہ ریل کی لائین انجینرنگ اور فن تعمیر کا عجوبہ ہے۔ کہیں لائین ہمارے ساتھ چلتی تھی۔ کہیں سرنگوں میں داخل ہو کر غائب ہو جاتی تھی۔ کہیں ہمارے نیچے سے نکلتی اور کہیں اوپر سے گذر جاتی تھی۔ اس طرح ہم اور ریل کی لائین آنکھ مچولی کھیلتے ہوئے جا رہے تھے۔

ہم ڈھائی ہزار فیٹ کی بلندی پر چکر کھاتے ہوئے چڑھتے چلے جا رہے تھے۔ میرا سر چکرانے لگا تھا۔ چاروں طرف دھوپ سے جھلے ہوئے

Marfat.com

تپتے ہوئے سخت چٹانوں کے پہاڑ تھے۔ چوٹیوں پہ بادل منڈلا رہے تھے
نیچے گھاٹیوں اور وادیوں میں کسی نالے کی ریت چمکتی ہوئی دکھائی دیتی تھی
کہیں کہیں کوئی قلعہ نما گاؤں نظر آجاتا تھا۔ یہاں کا ہر گاؤں قلعہ ہے۔
یہاں کی ایک ایک چٹان قلعہ ہے۔ ہر راستہ ہر موڑ قلعہ ہے اور ہر جوان
ہر بچہ۔ ہر بوڑھا، ہر عورت سپاہی ہے ـــ دور دور تک پہاڑوں پر
کوئی انسان نظر نہ آتا تھا۔ کہیں کہیں کسی بکری یا بھیڑ کی ممناہٹ سنائی
دیتی تھی۔ کہیں یہ بکری یا بھیڑ پہاڑ کی چوٹی پر یا کسی چٹان پر کھڑی ہوئی ہوتی
تھی۔ کہیں کسی گہری وادی میں گھاس چرتی ہوئی دکھائی دیتی تھی۔ اور پاس
ہی کوئی چرواہا لڑکا سوٹی لئے بس کو گھورتا ہوتا تھا۔

تیس ہزار فیٹ بلندی پر چڑھنے کے بعد ہم شاہ گئی پہنچے۔ یہاں
شملہ کی سی ہوا کا ایک لطیف جھونکا آیا اور میرے ذہن میں شملہ کی یاد
تازہ کر گیا ـــ ریج (RIDGE) ـــ مال روڈ ـــ اسکینڈل پوائنٹ
ـــ جاکو ـــ دیودار کے اونچے اونچے خوبصورت درخت ـــ دور دور
تک پہاڑوں پر ہریالی ـــ رات کو روشنی میں جگمگاتا ہوا شملہ ـــ پھر وہ مکان
جس میں میں ٹھہرا ہوا تھا۔ کتنی خوبصورت وادی کے سرے پر بنا ہوا تھا
ـــ چاروں طرف کے پہاڑ سبز سبز۔ دور دور تک سبز۔
شاہ گئی سے سڑک ڈھال کی طرف اترتی ہے پھر تورخم تک ڈھال
ہے۔ تورخم اور پشاور کی سطح میں بہت کم فرق ہوگا۔ پہاڑوں میں
اہم مقامات پر چوکیاں (PAKETS) دکھائی دیتی ہیں جن میں ریل

Marfat.com

کی لائین لے گئے ہیں اور جہاں ریل کی لائین نہیں جا سکتی ہے وہاں تارکول کی پختہ سڑکیں بنادی ہیں۔

علی مسجد کوئی مسجد نہیں ہے۔ جس میں ملّا، نماز پڑھتے ہوں بلکہ ایک چھوٹا سا قلعہ ہے جو درہ خیبر کی سب سے تنگ جگہ ایک چٹان کے سرے پر بنا ہوا ہے۔ یہاں ایک پہاڑی نالے نے پہاڑ کو کئی سو فیٹ گہرا کاٹ دیا ہے۔ سڑک نالے کے کنارے ہو کر جاتی ہے۔ نالے میں ایک پمپنگ اسٹیشن بھی قائم ہے۔ جو آس پاس کی پہاڑی چوکیوں کو پانی پہنچاتا ہے انتہائی تنگ مقام ایک اور آتا ہے جہاں نالے کے اوپر پہاڑ کی کمر کاٹ کر سڑک بنائی گئی ہے اور گہرے کھڈ میں نالا بہتا ہے۔ اکثر جگہ سیمنٹ کے بڑے بڑے بلاک (BLOCK) بنا کر سڑک کے کنارے ڈال دیئے ہیں تاکہ راستہ فوری طور سے بند کیا جا سکے

ایک بجے دن کو لنڈی کوتل پہنچے۔ ہم بس سے اتر گئے اور لیس پوسٹ آفس چلی گئی۔

لنڈی کوتل بلند پہاڑوں کے درمیان ایک چھوٹا سا قصبہ ہے۔ یہاں ایک چھاؤنی بھی ہے۔ پہاڑ کے دامن میں منڈی یا بازار ہے لوگ دور دور سے۔ پہاڑوں کے پیچھے سے۔ آس پاس کے گاؤں سے خرید و فروخت کرنے آتے ہیں۔ ہم ڈر رہے تھے کہ پٹھان لوگ کہیں گے "کافر فرنگی بچے کا لباس پہن کر آیا ہے"، مگر ہم بغیر خوف اور جھجک ان میں گھل مل گئے۔

Marfat.com

ہم ایک زینے دار تنگ راستے سے ہوکر پہاڑ کے پیچھے بازار میں پہنچے۔ ایک دوکان پر بکرے لٹکے ہوئے تھے اور لوگ کڑھائی میں گوشت بھون بھون کر کھارہے تھے۔ ہم اسی دوکان پر گئے اور گوشت کا بھاؤ کرنے لگے۔ اتنے میں ایک خان آیا اور کہنے لگا ”تم کیا کھانا چاہتا اے؟ — یہ گوشت سوا روپی سیر اے — لے لو — ؟ ہم گوشت کھانا تو چاہتے تھے مگر اس کے بھننے میں وقت لگتا اور ہمیں بہت جلد کھانا کھا کر بس پر پہنچ جانا چاہئے تھا۔

خان ہمیں ایک بڑے احاطے سے ہوکر ایک دوسرے ہوٹل میں لے گیا ہوٹل میں میز کرسیوں کی جگہ بڑی نرم ہری ہری۔ خشک گھاس بچھی ہوئی تھی۔ ہم جوتے اتار کر گھاس پر بیٹھ گئے۔ خان کہنے لگا ”ہم یہ گھاس مسجد میں بچھاتا ہے یہ بوت روپی کا آتا ہے — یہ گھاس وہ — جو سامنے پہاڑ کی چوٹی پر دکھائی پڑتا ہے۔ وہی اے! یہ قدرت کی کاریگری ہے خشک اور پتھر چٹانوں کی درازوں میں اوس کی نمی پہنچ جانے سے یہ گھاس اُگ آتی ہے۔

خان ہماری میزبانی کرتا رہا۔ خود ایک بیرے کیطرح نرم نرم تنوری روٹیاں لا لا کر ہمیں کھلاتا رہا۔ ہم نے کہا خان تم بھی آجاؤ — ”ہم نہیں کھائے گا۔ بس تم کھائے۔ ہم بوت کھایا“

میں نے پوچھا ”خان؟ یہ بوٹی اتنی سخت اور سُرخ کیوں ہے؟“ ”یہ یہاں کا پانی کا تاثیر ہے — تمہاری طرف کا گوشت پتلا ہوتا ہے۔ یہ طاقت کا دیتا اے“ وہ ہم سے باتیں کرتا رہا کراچی کا حال پوچھتا رہا

Marfat.com

کارخانوں اور روزگار کے بارے میں معلومات کرتا رہا پھر کہنے لگا " ہم کوئی لالچ نہیں ہے۔ ہم تم سے کچھ نہیں مانگتا۔ تم یہ کہے گا کہ ہم وہاں گیا کوئی ہمارا خاطر بھی نہیں کیا ــــ تم یہاں رک جاؤ ــ رات کو ہمارے پاس رہو پھر ہم تمہاری خوب خاطر کرے گا " ہم کھانا کھا چکے تو وہ ہاتھ دھلانے لگا ہم نے بل ادا کیا پھر ہمیں وہ ایک دوسرے ہوٹل میں لے گیا۔ کہنے لگا " آؤ ــــ تم کو ہم چائے پلائے گا۔ یہاں کا چائے بوت ہاضم ہوتا ہے ابھی جو کچھ کھایا ہے سب ہضم ہو جائے گا " ہم نے بازار سے کابلی انگور خریدے انگور اچھے نہ تھے۔ خاص بازار میں ایک ہوٹل تھا۔ رکارڈ بج رہے تھے۔ دور دور سے آئے ہوئے پٹھان ہوٹل کے اندرونی حصے میں بیٹھے ہوئے چائے پی رہے تھے اور گپیں ہانک رہے تھے۔ بغیر دودھ کی سبز چائے ہمارے سامنے آئی۔ چائے کافی مزیدار تھی۔

سامنے سڑک کے کنارے کچھ لوگ پہاڑ کا دامن کاٹ کر زمین ہموار کر رہے تھے تاکہ کچھ اور دوکانیں بنا سکیں ممو بھیا نے پوچھا۔ " یہ لوگ پہاڑ کیوں کھود رہے ہیں "ــــ ؟؟

" وہاں دوکان بنائے گا۔ یہ زمین بڑا قیمت کا ہے ــ روپے والے ملک کا ہے۔ وہ زمین کا بوت روپے لے گا "

ملک کے پاس بہت روپیہ ہے وہ زمین کا بہت روپیہ لیتا ہے وہ روپیہ سے روپیہ بناتا ہے روپیہ ــــ جس سے روٹی آتی ہے جس سے کپڑا آتا ہے ــــ روپیہ ــــ جس سے سب کچھ آجاتا ہے اور سب کچھ ہو جاتا

Marfat.com

ہے اور جو نہ ہو سکتا ہو وہ بھی ہو جاتا ہے ۔ روپیہ ـــ روپیہ سے ملک بن جاتا ہے اور روپیہ نہ ہو تو آدمی پہاڑ کھودتا ہے چٹانیں کاٹ ڈالتا ہے پھر بھی بے کار ـــ بے سود ـــ خالی ہاتھ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

ہمیں سامنے سڑک کے پل کے نیچے سے ایک صاحب آتے ہوئے دکھائی دیئے ۔ کافی عمر ـ مسن جیسی سفید داڑھی ۔ سرخ اور نورانی چہرہ سفید دودھ جیسے اُجلے اجلے کپڑے پہنے ۔ سفید عمامہ باندھے گھٹنوں سے نیچے تک لمبا اور سفید کرتا ۔ سفید شلوار ـــ بڑی شان و تمکنت سے آرہے تھے ہم کابل میں بہت سے لوگ بڑے ادب سے چل رہے تھے ۔ بازار میں دوکاندار انہیں دیکھ کر کھڑے ہو گئے اور جھک جھک کر سلام کرنے لگے ۔ ہمارا ہوٹل ذرا ہٹا ہوا تھا ۔ اس لئے وہ دور سے ہم پر ایک طائرانہ نظر ڈالتے ہوئے چلے گئے ۔ ہم بدستور چلتے رہے ۔

" خان یہ کون تھا " ؟ میں نے پوچھا

" یہ یہاں کا تحصیلدار تھا بڑا آدمی اے "

میں چائے کا بل ادا کرنے لگا ۔ خان نے میرا ہاتھ اس زور سے پکڑا جیسے بازو فولادی شکنجے میں کس گیا ہو ۔ بڑی دیر تک درد کرتا رہا " اخو یائی ـــ نہیں ـــ تم پیسے نہیں دے گا ـ ہم دے گا "

میں نے کہا " نہیں ـــ خان پیسے دینے دو "

اب کہ خان نے میری گدی دبائی اور ہنستے ہو دھکا دیا ۔

" چلو موٹر پہ ہم لے چلے گا " آپ اسے جنگلی اور وحشیانہ طریقہ

Marfat.com

کہیں گے مگر میرے نزدیک شاید یہی یہاں کا خلوص اور خاطر و مدارات تھی۔ خان ہم سے کچھ نہیں چاہتا تھا وہ بے لوث دل سے ہماری مہمان نوازی کر رہا تھا میرا دل چاہا خان سے لپٹ جاؤں اور کہوں "خان ــــ! میں تمہیں غلط سمجھا۔ میں تمہیں وہ "آغا" سمجھا جو ہٹے کٹے شلوار پہنے بڑا سا پگڑ سر پر باندھے ایک لمبا بھولا کاندھے پر لٹکائے اپنا، سودی روپیہ وصول کرنے آیا کرتے تھے۔ بچپن میں میں تم سے بہت ڈرتا تھا اور سمجھتا تھا کہ تم بچوں کو اپنے جھولے میں پکڑ کے بند کر لے جاتے ہو۔ مگر کبھی کبھی ہم کئی بچے تمہیں دور سے دیکھ کر چلاتے ہوئے بھاگتے تھے۔

آغا۔! آغا کی دم میں دھاگا

آغا۔! مرغی لے کے بھاگا

مگر تم ان آغاؤں جیسے نہیں ہو۔ تم بڑے خوش اخلاق اور مہمان نواز ہو۔ سادا اور بے لوث ہو۔ تمہیں معاش کی تنگی ہے۔ ان سنگین پہاڑوں میں کچھ پیدا ہوتا نہیں یہاں خدا کی رحمت برستی نہیں جو زندگی کا سب سے بڑا ذریعہ ہے تمہارے پاس "روپی" بھی نہیں ہے جو آج کل سب سے بڑی طاقت ہے یہ طاقت حاصل کرنے کے لئے نہ تو تم اپنی جان کی پروا کرتے ہو نہ دوسروں کی جان کی اور جب بھوک ستاتی ہے تو آدمی کیا نہیں کر گذرتا۔؟ ملک اور سردار تمہاری کوئی پرواہ نہیں کرتے۔ ان کے پاس روپی ہے۔ وہ روپی سے مزے اُڑاتے ہیں اور کبھی کبھی تم پر ظلم بھی توڑتے ہیں

"دل چاہتا ہے تمہارے کان نوچ لوں! تم غریبوں کی فریاد

Marfat.com

نہیں سُنتے "

"دل چاہتا ہے تمہارے خنجر کی نوک توڑ دوں تم غریبوں کو ذبح کرتے ہو۔ (پشتو سے)

ہم بازار سے نکل کر اوپر سڑک پر آئے اور ڈاکخانہ روانہ ہو گئے راستے میں ایک چھوٹا سا تالاب ملا کسی پہاڑی کو بند باندھ کر روک دیا تھا ہم تھوڑی دور چل کر ڈاکخانہ پہنچ گئے لیں تیار تھی۔

لیں بازار کیطرف لوٹی کیوں کہ سڑک بازار ہو کر جاتی تھی یہاں خان ہم سے بغیر ملے اور مصافحہ کئے چپکے سے اتر کر کہیں غائب ہو گیا۔ میں اس انتظار میں تھا کہ خان سے رخصتی ہاتھ ملاؤں گا خدا حافظ کہوں گا۔ مگر خان غائب تھا جیسے ہیں وہ جانتا ہی نہ تھا۔

تھوڑی دور ڈھال پہ چلنے کے بعد نیچے وادی میں ہمیں لنڈی خانہ نظر آنے لگا۔ یہاں ریل کی لائین ختم ہو جاتی ہے۔ ہم تھوڑی دیر میں تورخم پہنچ گئے۔ یہ ہمارے سفر کی آخری منزل تھی۔ ایک پہاڑی نالے کے کنارے پاکستان کی آخری چوکی بنی تھی۔ پر بر (BAREAR) لگا کر سڑک روک دی گئی تھی۔ اور ایک بورڈ لگا ہوا تھا جس پر انگریزی میں لکھا ہوا تھا۔

"پاکستان اور افغانستان کی سرحد"

"اس سرحد سے بغیر پاس پورٹ دکھائے کوئی نہیں گذر سکتا"

ہم ڈیورنیڈ لائین یعنی پاکستان اور افغانستان کی سرحد پر کھڑے تھے حد بندی کے تار دور تک نظر آتے تھے۔ اس طرف ایک جوان ملیشیا

Marfat.com

لباس میں پہرہ دے رہا تھا۔ دوسری طرف ایک چھوٹے سے کیبن میں پستہ قد خاکی لباس پہنے۔ برنشین ہیٹ لگائے ہوئے رائفل کاندھے پر رکھے چپ چاپ۔ خاموش۔ ایک افغان سپاہی کھڑا ہوا ہمیں گھور گھور کر دیکھ رہا تھا

"ادھر نہ جائیے گا"!! پاکستانی سپاہی نے بڑے محتاط لہجے میں اس طرح کہا گویا ہم ذرا بھی ادھر گئے تو کسی خوفناک اندھیرے غار میں گر پڑیں گے اور جس میں سے شاید پھر کبھی نہ نکل سکیں یا افغان سپاہی کے رائفل کی گولی ہمارے سینوں کے پار ہو جائے گی۔

سپاہی نے کہا "آپ ادھر اس پہاڑی پر چڑھ کر دیکھ آئیے"!

ہم ڈرتے ڈرتے پہاڑی پر چڑھ گئے۔ ہمیں دور تک افغانستان کے دھندلے دھندلے بنجر۔ خشک۔ دھوپ سے جھلسے ہوئے اور تپتے ہوئے سنگلاخ پہاڑ دکھائی دیتے تھے۔

ہم مشکل سے دس منٹ بھی نہ کھڑے ہوئے تھے کہ ڈرائیور نے ہمیں آواز دی ہم پہاڑی سے اتر آئے۔ رائیل افغان میل کو ڈاک دے دی گئی تھی، میل ہم سے پہلے یہاں آچکا تھا۔ اور پاسپورٹ کی دیکھ بھال کرا کے ہمارا انتظار کر رہا تھا۔ سیر پر ہٹا دیا گیا اور رائیل افغان میل افغانستان میں داخل ہو کر کچی سڑک پر دھول اڑاتا ہوا ہماری نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ ہم نے افغانستان سے آئی ہوئی ڈاک لی اور واپس روانہ ہو گئے۔

---

Marfat.com

(۲)

# واپسی

Marfat.com

# واپسی

ہمارا یہ سفر منوڑہ (کراچی) سے تورخم (درہ خیبر) تک تقریباً ایک ہزار پچاسی میل کا ختم ہوگیا تھا اور اب ہم واپس ہو رہے تھے ہمارے ساتھ افغانستان کے چند حاجی بھی سوار ہو گئے۔ جو آپس میں کبھی لڑنے لگتے تھے۔ معلوم ہوتا تھا کہ کئی چٹانیں آپس میں ٹکرا رہی ہیں ہم تھوڑی دیر میں لنڈی کوتل پہنچ گئے میں کھڑکی سے جھانکتا رہا کہ شاید خان سے ملاقات ہو سکے مگر خان کا کوئی پتہ نہ تھا۔ ایک چھوٹا سا بچہ مومو بھیا کے پاس کھڑا ہو گیا مومو بھیا فقیر سمجھ کر اس کو کچھ پیسے دینے لگے۔ ہمارے ڈرائیور خان نے جب یہ سنا کہ ہم لوگ بچے کو کچھ پیسے دینے والے ہیں تو اس نے بچے کو پشتو میں بری طرح ڈانٹا اور ہم سے بھی حقیر میں کہا۔

"پیسے نئیں دے گا۔ یہاں یہ قاعدہ نئیں ہے"

غریب بچے نے سوال بھی نہ کیا تھا کوئی ایسا اشارہ بھی نہ کیا تھا۔ جس سے بھیک مانگنے کا اظہار ہوتا ہو۔ وہ تو صرف ہمیں کھڑا ہوا دیکھ رہا تھا۔ مگر ایک غیور پٹھان کی غیرت و حمیت اس بات کو کب گوارا کر سکتی تھی کہ اس کی قوم کا یہ شاہین بچہ جس کو رائفل کاندھے پر لٹکانا ہے۔ سینے کو کارتوس کی پیٹیوں سے سجانا ہے۔ چٹانوں پر بیٹھ کر خوشحال خان خٹک کے آزادی کے نغمے الاپنا ہیں۔ کسی کے آگے ہاتھ پھیلائے "بابا اللہ کی راہ پر دو ماہ اس طرح بھیک مانگ کر زندگی گذارے۔ غیروں کے ٹکڑوں

Marfat.com

پر گذر اوقات کرے۔ اور باپ دادا کے ناموں کو بٹہ لگائے۔

ہم چڑھتے چلے جا رہے تھے۔ وادیوں میں کہیں کہیں چشمے تھے۔ جن کے کنارے ایک آدھ باغ تھا اور آبادی بھی معلوم ہوتی تھی۔ ایک جگہ بس ٹھہر گئی کچھ لوگوں کو بس میں بیٹھنا تھا اور دو ڈھائی سو فیٹ گہری وادی میں ایک چشمے کے کنارے کچھ گھر بنے ہوئے تھے۔ ایک لڑکے نے ملک صاحب کو ایک کارڈ دیا تاکہ وہ اس کو ڈاک میں ڈال دیں۔ ڈاک میں جانے والے خطوط بس پر دے دیئے جاتے ہیں۔ کارڈ اردو میں لکھا تھا میں نے پوچھا "یہ کارڈ تم نے خود لکھا ہے"؟

"ہاں ہم نے خود لکھا ہے" لڑکے نے جواب دیا۔

"تمہارے گاؤں میں اسکول ہے"؟

"نہیں۔ شاہ گئی میں ہے وہاں جاتے ہیں"

شاہ گئی سامنے کے پہاڑ پر چھوٹی سی پوسٹ تھی۔ شاہ گئی سڑک کتنی اونچائی تھی کتنی ڈھال تھی۔ کتنا دشوار راستہ تھا اگر کوئی پھسل جائے تو نہ جانے کہاں؟ گہرے کھڈ میں گرے۔ ہر سال ہزاروں بچے شاہ گئی کی چڑھائی چڑھتے ہیں۔ بہت سے جی ہار دیتے ہیں۔ پھسل جاتے ہیں اور کھڈ میں گر کر نہ معلوم کہاں غائب ہو جاتے ہیں۔ کون جانے؟ کب وفات آئے گا۔؟ جب شاہ گئی تک سیدھا ہموار۔ بغیر اونچ نیچ راستہ بنا دیا جائے گا اور پھر ہر بچہ شاہ گئی تک بلا خوف۔ بلا جھجک۔ آسانی سے جلدی جلدی چڑھ جایا کرے گا۔؟

Marfat.com

ہمارے قریب سے ایک موٹر گذر گیا جو افغانستان سے آ رہا تھا اور پشاور جا رہا تھا۔ موٹر میں انگریز بیٹھے ہوئے تھے۔ انگریزوں کے ساتھ ان کی عورتیں تھیں مگر کوئی محافظ دستہ نہ تھا۔ اب تو اس انگریز کی حکومت ختم ہو چکی تھی۔ جس کی تاک میں ہر پٹھان پہاڑی کی آڑ میں۔ چٹان کی اوٹ میں چھپا بیٹھا رہتا تھا اور ڈز کی آواز کے ساتھ ایک سفید فام لڑکھڑا کر گر جاتا تھا اب اس ہدایت کی بھی کوئی اہمیت نہیں رہ گئی تھی۔ کہ عورتوں کے ساتھ محافظ دستہ ہونا چاہیئے۔

ہم یہاں سے چل کر شاہ گئی پہنچے ایک موڑ سے نکل کر درے میں سے دور۔ دُھندلا دُھندلا پشاور نظر آ رہا تھا اور پہاڑ کے دامن میں جمرود اور اس کا قلعہ دکھائی دیتے تھے ہم سطح سمندر سے تقریباً تین ہزار فٹ کی بلندی سے یہ منظر دیکھ رہے تھے۔ بس رفتہ رفتہ چکر کھاتی ہوئی پہاڑ سے اُتر گئی اور جمرود آ کر ٹھہر گئی۔ یہاں پاس کا دوسرا حصہ جمع کرا دیا ہم تھوڑی دیر ٹھہر کر دوبارہ چل دیئے اور اسلامیہ کالج ہوتے ہوئے پانچ بجے کے قریب جی۔ پی۔ او پہنچ گئے۔

میرا سر چکرا رہا تھا ہم ہوٹل پہنچتے ہی گھوڑے سے بیچ کر خوب سوئے اور سات بجے تک کوئی خبر نہ لی۔ دوسرے دن ہم کہیں نہیں گئے صرف شام کو میوزیم دیکھنے گئے۔ میوزیم کی عمارت کافی خوبصورت تھی ایک پائیں باغ بھی تھا۔

لارڈ کرزن تھا تو تنگ مزاج مگر ARCHEALOGICAL

DEPARTMENT (محکمہ آثار قدیمہ قائم کرکے
نام کر گیا۔ "سمو بھیا میوزیم کی عمارت دیکھ کر یو لے۔
"ہوں" میں نے تصدیق کی۔

ہم میوزیم میں داخل ہو گئے۔ میوزیم بند ہونے والا تھا۔ لہذا ہم جلدی جلدی چیزوں پر نظریں دوڑانے لگے۔ زیادہ تر چیزیں تخت بہائی ضلع مردان سے کھود کر لائی ہوئی رکھی تھیں۔ درہ خیبر میں سڑکوں کی تعمیر کے زمانے میں کھدائی ہوتے وقت جو چیزیں ملی تھیں وہ بھی یہاں رکھی تھیں۔ مہاتما بدھ کے چھوٹے بڑے مجسمے تھے۔ مہاراجہ کنشک کے زمانے کے قیمتی سکے اور کئی نادر اشیا جمع کی گئی تھیں۔ کچھ ماڈل بھی تھے جو قابل تعریف تھے۔ ہم اوپر کی منزل پر نہ جا سکے کیونکہ وقت ختم ہو گیا تھا۔

ہم پرانے شہر چلے گئے اور شام تک شہر میں گھومتے رہے یہاں معلوم ہوا کہ چترال کی پہاڑیوں پر بارش ہونے کی وجہ سے ریلوے لائین اور پختہ سڑک دونوں جگہ جگہ سے بہہ گئی ہیں۔ نہ تو ریل جا سکتی ہے اور نہ بس ہم ہوٹل آ گئے۔ رات کا کھانا کھا کر میں تنہا ٹہلنے نکل گیا۔

میں مال روڈ پر چلا گیا۔ پشاور کی مال روڈ مجھے بہت پسند تھی دو رویہ بڑے گھنے اور اونچے اونچے درخت تھے بنگلے پھولوں کی بیلوں سے لدے ہوئے تھے ساری سڑک خوشبو سے معطر ہو رہی تھی۔ سیمابی قمقموں کی ہلکی ہلکی روشنی اور بھی خوبصورت معلوم ہوتی تھی۔ سڑک پر دور دور تک انسان کا نشان نہ تھا۔ بڑی پُرسکون سی خاموشی۔ زندگی کی تگ و دو سے دور

Marfat.com

—— ایسی خاموشی —— ایسا سکون . . . ایسا اطمینان اور چین میں پشاور کی مال روڈ پر حاصل کر رہا تھا۔ میں کراچی سے بہت دور تھا۔ بڑی بڑی بسیں دیوؤں اور اژدہوں کی مانند ادھر سے ادھر ستاتی پھرتی ہیں —— میں اپنی سائیکل پر جب بھی ان بسوں میں گھر جاتا ہوں تو مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ موت نے گھیر لیا ہے —— کوئی نہ کوئی بس مجھے پیس کر سرمہ بنا دے گی —— برق رفتار موٹر سائیکلیں پھٹ پھٹاتی ہوئی قریب سے گذر جاتی ہیں۔ تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کوئی راکٹ بم گذر گیا —— اور اگر ان سے ٹکر ہو جائے تو جسم ٹکڑے ٹکڑے ہو کر بکھر جائے۔

جب میں اس شور و غل۔ ہنگامہ بے چینی اور بے اطمینانی سے گھرا جاتا ہوں تو میں تبس گارڈن اور فریر ہال بھی نہیں جاتا کیوں کہ وہاں بھی لوگوں کے ہجوم سے سکون مٹ جاتا ہے۔ معصوم بچوں کے قہقہے اور ان کی کلکاریاں بھی مجھے ایسی حالت میں راس نہیں آتیں۔

میں پولوگراؤنڈ پار کرتا ہوا پیلس ہوٹل کے سامنے سے کوئنس دے برج پر چلا جاتا ہوں یہ جگہ مجھے بہت پسند ہے —— سامنے سمندر ہے۔ متوڑہ پر لائٹ ہاؤس دکھائی دیتا ہے۔ نیچے سے ریل کی لائین گذرتی ہے —— چاروں طرف کا منظر بہت اچھا دکھائی دیتا ہے —— پیلس ہوٹل۔ جناح کورٹ —— کراچی کارپوریشن —— لکشمی بلڈنگ —— کاٹن ایکسچینج —— پورٹ ٹرسٹ —— کیماڑی بندرگاہ . . . . . . .

میں نے ایک صاحب سے پوچھا "یہ سڑک کہاں جا کر ختم ہو گی؟"

"کینٹ اسٹیشن کے قریب" وہ مجھے پردیسی سمجھ کر پوچھنے لگے کہ آپ کس لئے آئے ہیں۔ جب میں نے بتایا کہ میں کراچی سے سیر کرنے آیا ہوں تو بڑی حیرت سے کہنے لگے "آپ یہاں، سیر کرنے آئے ہیں؟ یہاں کیا رکھا ہے؟ یہاں کیا چہل پہل ہے"

میں مسکرایا "میں چہل پہل ہی سے تو اکتا کر بھاگا ہوں۔ کراچی میں ہر وقت کا شور و غل تھا۔ یہ سکون وہاں نہیں ہے! یہ اطمینان نہیں ہے جو یہاں ہے؟"

میں اسٹیشن گیا دفتر معلومات میں معلوم ہوا کہ آج اس وقت جانے والی گاڑی نہیں گئی کیوں کہ ریلوے لائین ابھی تک درست نہیں ہو سکی ہے۔ رات میں پھر بڑے زور کی بارش ہو گئی اور صبح تک ہوتی رہی۔ ہم سامان درست کر کے بھیگتے ہوئے اسٹیشن پہنچے اور ٹکٹ لے کر گاڑی میں بیٹھ گئے۔

"سامان اُتار لیئے گاڑی نہیں جائے گی" زندگی میں پہلا موقع تھا کہ ٹکٹ لے کر گاڑی میں بیٹھے اور پھر ٹکٹ واپس دے کر کرایہ واپس لیا ہو۔ معلوم ہوا راستہ درست ہونے کی جو امید تھی۔ رات کی بارش نے وہ بھی ختم کر دی۔ مجبوراً ہوٹل آئے۔ ہوٹل کے نیچے ہی گورنمنٹ بس سروس کا اسٹینڈ تھا۔ یہاں معلوم ہوا بس بھی نہیں جا سکتی۔ دن بھر ٹیلیفون پر اسٹیشن سے پوچھتے رہے بس اسٹینڈ بھی گئے مگر کوئی سبیل نہ نکل سکی۔

میں شام کو ٹہلتا ہوا مال روڈ پر نکل گیا وہاں سے تانگہ کر کے پرانے شہر چلدیا۔ تانگے والے ادھیڑ عمر کے پٹھان تھے اردو اتنی صاف اور

Marfat.com

شستہ بولتے تھے کہ میں نے اب تک پشاور میں اتنی اچھی اردو بولنے والا کوئی نہ پایا تھا۔ آخر مجھ سے رہا نہ گیا اور میں نے بڑے تعجب سے اُن سے کہہ ہی دیا "مجھے معلوم نہ تھا کہ یہاں بھی اتنی اچھی اردو بول سکتے ہیں ــــ ؟"

"تو کیا آپ یہ سمجھتے ہیں۔ کہ صرف آپ ہی لوگ اردو بولنا جانتے ہیں ــ؟ میں نے باقاعدہ اردو پڑھی ہے۔ میں میٹرک ہوں" ــــ

میں اور بھی دنگ رہ گیا "پھر آپ ــ؟ تو پھر آپ ــ یہ تانگہ کیوں چلاتے ہیں ؟؟ ــ"

ایک ٹھنڈی سانس بھر کر بولے "بابو صاحب ــ! یہ بڑی دردناک کہانی ہے۔ میرے باپ گورنمنٹ کے ملازم تھے کافی کھاتے پیتے اور صاحبِ جائیداد تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ میں بھی پڑھ لکھ کر کسی اچھی جگہ ملازم ہو جاؤں ــ بابو صاحب! ملازمت بڑی اچھی چیز ہوتی ہے ــ مگر بابو صاحب! جب بدقسمتی ساتھ ہو تو پھر کیا ہو سکتا ہے ــ؟ میں آپ سے بھی کہوں گا کہ آپ بھول کر بھی بُری باتوں میں نہ پڑیئے گا ــ بس بابو صاحب خدا کا کرنا ایسا ہوا ہے کہ شیطان نے انگلی دکھائی اور میں بُری عادتوں میں پڑ گیا ــ مگر جیسے تیسے بن پڑا میں نے میٹرک کر لیا تھا۔ باپ کا سایہ سر پر تھا۔ کوئی فکر نہ تھی۔ میں نے ملازمت بھی نہ کی ــ بُرا وقت جب آتا ہے تو کہہ کر نہیں آتا ــ باپ کا انتقال ہو گیا۔ کچھ عرصے بعد ماں کا بھی ہو گیا۔ آگے پیچھے کوئی نہیں تھا۔

Marfat.com

جائیداد میرے نام ہوئی مگر میں اڑا گیا۔۔۔ جب کوڑیوں کو محتاج ہونے لگا تو پھر میری آنکھیں کھلیں۔ جو کچھ گھر میں رہ گیا تھا اس کو جوڑ جاڑ کے تین تانگے بنائے جن سے گذارا ہو جاتا تھا۔ قیام پاکستان سے قبل۔ میں راولپنڈی میں تانگہ چلایا کرتا تھا۔ ایک سکھ کی سولہ برس کی لڑکی میرے تانگے کے نیچے آکر مر گئی۔ مجھ پر مقدمہ چلا۔ بڑی کوشش کی مقدمہ بازی میں ساری جائیداد بک گئی۔ پھر بھی جیل کاٹی۔ اب یہ ایک تانگہ بنا لیا ہے اور ایک گھر رہ گیا ہے۔ گذر بسر ہو جاتی ہے"

میں ان کی اس آپ بیتی سے بہت متاثر ہوا۔ تانگہ قصہ خوانی بازار کے نکڑ پر پہنچ چکا تھا۔ جہاں مجھے اترنا تھا۔

میں کئی بازاروں سے ہوتا ہوا تحصیل کی عمارت دیکھتے گیا عمارت کافی بڑی تھی اور ایک قلعہ کیطرح معلوم ہوتی تھی۔ اندر تھانہ تھا اس لئے سپاہی نے دروازے ہی پر روک دیا۔ میں واپس ہو گیا اور بڑی دیر تک شہر میں گھومتا رہا شہر کی بعض عمارتیں کافی پرانی تھیں۔

میں شہر کے باہر فردوس سینما، کے قریب ایک پارک میں گیا۔ کافی لمبا چوڑا پارک تھا لات ہو چکی تھی اس لئے کوئی رونق نہ تھی سینما کے سامنے بس کا اسٹینڈ تھا۔ یہاں سے راولپنڈی۔ نوشہرہ اور مردان کو بسیں جاتی تھیں۔ یہاں معلوم ہوا کہ اب صرف پختہ سڑک اس قابل ہو سکی ہے۔ کہ ٹریفک گذر جائے ایک بس بھی آئی۔ مسافروں سے حالات معلوم ہوئے میں ہوٹل آگیا۔ ہم نے یہ طے کر لیا کہ صبح چاہے کچھ ہو پشاور چھوڑ

Marfat.com

دیں گے۔ کیوں کہ ہوٹل میں مزید۔۔۔ ایک دن قیام کابل تو روپئے آیا مری کا پروگرام بھی منسوخ کر دیا۔ میرے پاس روپیہ بھی ختم ہو چکا تھا۔ صرف ممو بھیا کے پاس اتنا رہ گیا تھا۔ کہ ہم دونوں لاہور تک پہنچ جائیں اور راستے کے اخراجات بھی پورے ہو جائیں اس کے علاوہ ہم چاہتے تھے کہ ۱۴ اگست یوم آزادی کی پریڈ اور جلوس لاہور میں دیکھیں۔ اب ہمارے پاس صرف ایک دن رہ گیا تھا۔ جو سفر کا تھا۔

ہم نے ارادہ کر لیا کہ اب بس سے جائیں گے۔ نوشہرہ تک گاڑیاں آتی تھیں اور وہیں سے واپس ہو جاتی تھیں۔ لہذا ہم نے اس بس میں جو نوشہرہ ہو کر مردان جاتی تھی۔ سیکنڈ کلاس کی دو سیٹیں بک (BOOK) کرائیں بس میں ہمارے ساتھ زیادہ تر وہ لوگ تھے جو ریل سے نہ جا سکے تھے اور اب مجبور ہو کر بس سے سفر کر رہے تھے۔ شہر نکل جانے کے بعد ہماری بس باغوں میں سے جا رہی تھی سڑک کے دونوں طرف باغات تھے۔ سڑک پر بھی دو رویہ اونچے اونچے سایہ دار درخت لگے تھے۔ کہیں کہیں باغوں میں چھوٹی چھوٹی فیکٹریاں بھی تھیں جن میں پھلوں سے اچار چٹنی مربے وغیرہ تیار کرتے ہیں۔ ہمارے ساتھ ریل کی لائین بھی جا رہی تھی۔

دو اسٹیشن گذرنے کے بعد وہ علاقہ آگیا جو سیلاب سے متاثر تھا بڑے بڑے درخت جڑ سے اکھڑے پڑے تھے گاؤں بہہ گئے تھے۔ اور ان کے رہنے والے اونچی جگہوں پر ڈیرے ڈالے پڑے تھے۔ سامنے چراٹ کی پہاڑیاں تھیں اور پانی ابھی تک نالوں میں بڑی تیزی سے بہہ رہا

Marfat.com

تھا۔ایک جگہ کچھ مزدور اور انجینئر سڑک درست کر رہے تھے۔یہاں پانی نے کئی جگہ سڑک میں شگاف ڈال دیئے تھے۔چھوٹے چھوٹے شگاف تو بند کر دیئے گئے تھے۔صرف دو بڑے شگاف رہ گئے تھے جو پانی کی تیزی اور گہرائی کی وجہ سے بند نہ ہو سکے تھے۔ان پر تختے بچھا کر پل بنا دیئے تھے اور ٹریفک جاری کر دی تھی۔

بس رک گئی۔انجینئر صاحب آئے۔انہوں نے ہم لوگوں سے استدعا کی کہ آپ لوگ بس سے اتر جائیں تو اچھا ہے۔ہم سب بس سے اُتر پڑے اور خالی بس دھیرے دھیرے دونوں عارضی پلوں پر سے گذر گئی ہم پھر بس میں بیٹھ گئے۔

موسم نہایت صاف تھا۔بادل کُھل گئے تھے اور دھوپ چمک رہی تھی اور آئندہ بارش کا کوئی امکان نہ تھا۔سامنے دریائے کابل پوری روانی سے بہہ رہا تھا۔دریا نوشہرہ کے قریب سے ہو کر گذرا ہے۔ہمیں کشتیوں کا وہ پل نظر آ رہا تھا۔جو نوشہرہ کے قریب مردان اور رسالپور جانے کے لئے باندھا گیا تھا۔

ہم شہر میں بس اسٹینڈ پر اتر گئے۔اسٹیشن ایک میل دور تھا۔فوراً تانگہ کر کے اسٹیشن روانہ ہو گئے۔نوشہرہ چھوٹا سا شہر تھا۔ہم شہر کے جس حصّے سے گذرے وہ نہ تو بہت اچھا ہی کہا جا سکتا ہے اور نہ بہت بُرا۔گاڑی تیار کھڑی تھی۔میں ٹکٹ لینے بھاگا۔یہاں خیبر میل بھی کھڑا تھا۔جس کو صبح پشاور پہنچنا تھا۔ہم ایکسپریس کے تھرڈ کلاس میں بیٹھ گئے۔

Marfat.com

کچھ دیہاتی عورتیں اور بچے ہمارے چھوٹے سے ڈبے میں گھسنے لگے ان کے ساتھ پلنگ پٹی پائے۔ بڑی بڑی پھٹے پرانے کپڑوں کی گٹھڑیاں توا۔ چمٹا۔ پھکنی۔ چرخا۔ چکی۔ جاتا۔ چھوٹے چھوٹے بچے۔ روتے منہ بسورتے۔ چھاتیوں سے چمٹے۔ دودھ پیتے۔۔۔۔

میں غصے سے پاگل ہو رہا تھا "لاؤ۔ لاؤ مکان کی اینٹیں بھی کھود لاؤ۔ چھپر بھی لے آؤ۔ گائے اور بھینسیں بھی لا کر اس تھرڈ کلاس میں بھر دو"۔۔۔۔ ایک صاحب مجھے سمجھانے لگے "آپ نہیں جانتے۔ اگر آپ کے پیچھے یہ پڑ گئیں تو پیچھا نہ چھوڑیں گی" میں غصے میں چلایا "یہ زنانے ڈبے میں کیوں نہیں جاتیں؟"

زنانہ ڈبہ مردانہ نہیں ہو سکتا۔ مردانہ ڈبا زنانہ بنا لیا جاتا ہے۔ کوئی مرد زنانے ڈبے میں مجبوراً پناہ لینے کے لئے وقتی طور سے گھس جائے تو شامت آجاتی ہے "ائے ہوا۔ اللہ مارا۔ دیدوں پھوٹا۔ گھسا چلا آتا ہے۔ ائے بہن۔ دیکھتی ہو ذرا۔ کتنا لمبا تڑنگا۔ جوان جہاں ہے۔ اندھے کو دکھتا بھی نہیں۔ زنانے مردانے کی تمیز بھی نہیں۔ بلاؤ گارڈ بابو کو۔۔۔۔" اور کوئی اپنے "ان" کو بلانے کی دھمکی دیتی ہے۔ کوئی اپنے "بھیا" کو بلاتی ہے کوئی ہمت کر کے گارڈ کو آواز دیتی ہے۔ اور یہ "ذات شریف" چپکے سے کان دبا کر۔ بھیگی بلی کی طرح "اللہ مارے" "دیدوں پھوٹے" بنتے ہیں۔ بھاگ کر جان بچانے پر مجبور ہوتے ہیں اور کسی فٹ بورڈ سے چپک کر کھڑے ہو جاتے ہیں۔ اور یہ بڑے بڑے موٹے موٹے

Marfat.com

دیدے رکھتی ہوئیں بھی مردانے ڈبے میں دندناتی ہیں۔ ہماری شرافت دیکھئے کوئی لیٹا ہے تو اٹھ کر بیٹھ جاتا ہے "محترمہ" کے لئے جگہ نہیں ہے تو خود کھڑا ہو جاتا ہے جگہ دے دیتا ہے اور یہ "ذات شریفہ" دندنا کر بیٹھ جاتی ہیں شکریہ کے لئے لب بھی نہیں کھولتیں۔ ہونٹ سی لیتی ہیں۔ وہ زور جو زنانے ڈبے میں "اللہ مارا" "موبدول چھوٹا" کہتے سے نہ چوکتا تھا یہاں سرد ہو چکا ہے۔ راکھ ہو گیا ہے۔ ہونٹ سل گئے ہیں۔ گاڑی چلدی لاہور کیطرف نہیں بلکہ پشاور کیطرف۔ معلوم ہوا پشاور سے جو گاڑی صبح روانہ ہوئی ہے وہ اس مقام تک آئی ہے جہاں سے لائین بہہ گئی ہے اس گاڑی کے مسافر اس گاڑی میں بٹھائے جائیں گے۔ میل اور ایکسپریس آگے پیچھے چھوڑ دیئے گئے۔ ہم اس مقام پر پہنچے جہاں سے لائین بہہ گئی تھی۔ یہاں لائین میں ایک بہت بڑا شگاف پڑ گیا تھا۔ انجینئر اور مزدور بڑی مستعدی سے کام کر رہے تھے۔ شگاف کے دوسری طرف پشاور سے آئی ہوئی گاڑی کھڑی تھی۔ اس گاڑی کے مسافر ہماری گاڑی میں اور میل کے مسافر اس گاڑی میں بیٹھنے لگے۔ اس عرصے میں میں گاڑی سے اتر کر شگاف تک گیا۔ میرے ہاتھ میں کیمرہ لٹک رہا تھا۔ جب انجن کے سامنے سے گذرا تو ایک ڈائیور نے مجھ سے پوچھا "کیا فوٹو لے گا۔؟ اخبار والا ہے؟"

"ہاں سے! اخبار والا ہوں!" میں بھی اخبار والا بن گیا۔

"پھر دیکھتا کیا ہے جلدی لے!؟"

Marfat.com

ہیں لے فوٹو لئے اور الٹے پاؤں واپس ہوا کیوں کہ گاڑی کے چلنے میں زیادہ دیر نہ تھی۔ گاڑی کے اس مزید آنے جانے میں ایک بج گیا اس طرح نوشہرہ سے پانچ گھنٹے لیٹ چلے۔

دو بجے اٹک پہنچے ہم سب سے اگلے ڈبے میں بیٹھے تھے۔ اس لئے بکنگ بابو سے ملاقات نہ ہو سکی۔ گاڑی ٹھہری بھی بہت کم کیمبلپور اور حسن ابدال گذر گیا۔ حسن ابدال نکلنے کے بعد پہاڑ کے دامن میں دواہ، واقع تھا۔ سیمنٹ کے کارخانے آنا شروع ہو گئے تھے۔ سامنے پہاڑ کا سفید پتھر سیمنٹ بنانے کے لئے کاٹا جا رہا تھا۔ چھوٹا سا اسٹیشن تھا۔ گاڑی بہت کم ٹھہری۔ ٹکسیلا گذر گیا۔

ہماری گاڑی سرنگوں میں ہو کر ایک پہاڑی علاقے میں جا رہی تھی۔ ہمالیہ کے اونچے اونچے سلسلہ ہائے کوہ حد نگاہ تک پھیلے ہوئے تھے۔ کالے کالے بادل چھائے تھے اور دور کے پہاڑوں پر بارش ہو رہی تھی۔ راولپنڈی چھ بجے شام کو آیا۔ 'چک لالہ' سے چل کر بارش ہونے لگی۔ دھوپ میں بارش۔! گیدڑوں کا بیاہ ہو رہا تھا۔ بارش رک گئی۔ گاڑی پہاڑوں کی گھاٹیوں میں سے جا رہی تھی۔ دور تک خوفناک جنگل۔ ندی نالے۔ وادیاں اور کہستان دکھائی دیتے تھے۔ شام ہو چکی تھی۔ افق پر سورج ڈگمگاتا ہوا۔ تھک کر گر پڑا تھا۔ اور میں کرشن چندر کے ایک افسانے میں کھویا ہوا تھا۔ "میرا گاؤں ابھی دس کوس دور تھا۔ سہ پہر کے سائے لمبے ہو گئے تھے۔ خچر کے قدم

Marfat.com

سُست پڑ گئے تھے اور ڈھلواں پگڈنڈی کے دو رویہ سنبلو، بنا تھا اور بھیکڑ کی جھاڑیوں میں بیٹر ول۔ بینیوں اور رَرت چڑیوں نے سرکتا پُھدکنا اور شور مچانا شروع کر دیا تھا۔ کہیں کہیں کوئی جھینگر خوش الحانی سے پکار اُٹھتا اور پھر ایک دم چپ ہو جاتا۔ شاید اس نے بھی سہ پہر کی گھٹتی ہوئی دھوپ اور مٹتی ہوئی حدت میں شام کے سہانے خنک آمیز معطر سانس کو چھُو لیا تھا۔ اور اسی لئے بیقرار ہو کر چیخ رہا تھا۔ پھر وہ یکایک چپ ہو جاتا جیسے اُسے ابھی شام کی آمد کا یقین نہیں ہے ابھی نہیں ۔ ابھی نہیں ۔ شاید شام ابھی نہیں آئے گی۔ پھر کہیں سے ہوا کا کوئی لطیف جھونکا اس کے قریب سے گذر جاتا اور اُسے اپنے محبوب کی آمد کا یقین ہو جاتا اور وہ جھاڑیوں کی ٹہنی سے لگا ہوا وہیں مسرت سے چیخ اٹھتا۔ آئے گی، آئے گی، شام ضرور آئے گی۔ اسی آس یاس کے درمیاں کہیں خوشی کی منزل ہے ۔۔۔۔ لیکن میرا گاؤں تو ابھی دس کوس دور تھا اور میرا اَخچر تھک چکا تھا اور بھوک سے بیتاب ہو کر بار بار کان ہلاتا رک جاتا نتھنے پھیپھاتا اور ادِھر اُدھر دیکھنے لگتا ہے شاید منزل کا سُراغ ملے۔" مگر میں تو گاڑی میں بیٹھا تھا اور گاڑی فراٹے بھرتی چلی جا رہی تھی۔

اب اندھیرا چھا چکا تھا اور بہت کم دکھائی دیتا تھا۔ جہلم اور جہلم کا پل آیا۔ گجرات آیا۔ ہم نے کھانا کھایا۔ گاڑی پھر جلدی چناب کا پل اور وزیر آباد آیا لالہ موسٰے آیا اور گذر گیا۔ شاہدرہ باغ۔ ہماری گاڑی راوی کے پل پر گھڑ گھڑاتی ہوئی گذر رہی تھی۔ اور دور سے لاہور کی روشنیاں جگمگا رہی تھیں۔ لاہور قریب آ رہا تھا۔ بادامی باغ آیا

Marfat.com

رات کے ایک بجے ہم لاہور کے پلیٹ فارم پر کھڑے تھے۔

# کنارِ راوی

## لاہور

لاہور میں مال روڈ ہے لارنس گارڈن ہے۔ انار کلی بازار ہے شاہی مسجد ہے قلعہ ہے رنجیت سنگھ کا گردوارہ اور مقبرہ ہے منٹو پارک ہے شاہدرہ ہے نور جہاں کا مزار ہے کامران کی بارہ دری ہے۔ انار کلی کا مقبرہ ہے ماڈل ٹاؤن ہے۔ یونیورسٹی گراؤنڈ ہے۔ گورنمنٹ کالج۔ میڈیکل کالج اور نیشنل کالج اور فورمین کرسچین کالج ہے "داتا" کا مزار ہے۔ بھاٹی گیٹ ہے موری گیٹ ہے، شاہ عالمی گیٹ ہے اور بہت سارے گیٹ ہیں ــ اور ــ اور ٹبی بازار ہے ہیرا منڈی ہے۔

ہمیں اپنے ایک چچا زاد بھائی کے یہاں ٹھہرنا تھا میری رائے تھی کہ رات اسٹیشن ہی پر گذاری جائے اور اس وقت گھر نہ چلا جائے۔ گھر والوں کو تکلیف ہوگی اور بہت ممکن ہے کہ اتنی رات کو ہمیں گھر بھی نہ ملے مگر ممو بھیا کہنے لگے "نہیں ــ ہم تو اسی وقت گھر جائیں گے۔ اور وہیں سوئیں گے"

میں ممو بھیا کا موڈ بھانپ گیا۔ ممو بھیا اس وقت میری نہ مانیں گے،، تانگہ کیا اور تاریک سڑکوں پر ہوتے ہوئے بھاٹی گیٹ پہنچے اور اس بلڈنگ کا پتہ پوچھنے لگے جس میں ہمارے بھائی رہتے تھے۔ ایک گھنٹے تک ہم اصل مکان کے سامنے لاعلمی میں پریشان ہوتے رہے

Marfat.com

۔ میرا پارہ چڑھتا جا رہا تھا تانگے والا الگ بڑبڑا رہا تھا۔ میں نے غصے میں آکر ممو بھیا سے پوچھا "اب کیا کریں"؟!

ممو بھیا نے نہایت اطمینان سے اپنے مخصوص انداز میں جواب دیا "بیٹھ کے سوچا جائے"

پارے کی نلی پھٹ چکی تھی اور میں کھول رہا تھا۔ میں نے تانگے والے سے چلا کر کہا ۔۔ "چلو اسٹیشن ۔۔!!" اور تانگے میں کود کر بیٹھ گیا۔ ممو بھیا بھی چپ چاپ تانگے میں بیٹھ گئے۔ ہم دوبارہ اسٹیشن آئے مسافر خانہ میں زمین پر بستر کھول دیئے اور صبح تک خوب سوتے رہے۔

صبح اٹھ کر دوبارہ تانگہ کیا اور پھر اُسی جگہ آئے۔ اب کی بار ہمیں آسانی سے مکان مل گیا۔ ہم نے پشاور سے اپنی آمد کی اطلاع دے دی تھی۔ اس لئے کسی کو کچھ تعجب نہ ہوا۔ گھر کا دروازہ کھلا۔ بچے دوڑتے ہوئے آئے اور ہم سے لپٹ گئے۔

چاکو میاں، ایک تہمد باندھے۔ بنیان پہنے۔ دانتوں میں برش کرتے ہوئے نمودار ہوئے۔

"اخاہ ۔۔!"

اخو ۔۔!" اور ہم دونوں لپٹ گئے۔ چاکو میاں عمر میں مجھ سے بہت چھوٹے تھے مگر بھائی ہونے کے علاوہ وہ میرے بڑے گہرے دوست بھی تھے۔ چاکو میاں ہماری پارٹی کے ممتاز ممبروں میں تھے۔ ان کے نہ ہونے کی وجہ سے پارٹی سونی ہو جاتی تھی ۔۔ حد درجہ خوش مزاج۔

Marfat.com

نقل باز۔ ظریف طبع اور بڑی دلچسپ شخصیت تھے ہم دونوں جب بھی آپس میں گفتگو کرتے اور موضوع بحث سیاسی۔ علمی۔ ادبی ہوتا تو وہ نہایت سنجیدہ پُراز معلومات اور مدلل گفتگو کرتے تھے۔ ہمارے دل پسند موضوع زیادہ تر ادب۔ شاعری اور افسانہ نگاری ہوا کرتے تھے۔ چاکو میاں کے ساتھ بہت سی حسین یادیں وابستہ تھیں۔ میں نے اور انہوں نے بہت سے حسین لمحات ایک ساتھ گذارے تھے۔ چاندنی راتوں میں پہاڑوں پر بیٹھے ہیں۔ ویران سڑکوں پر چکر لگا رہے ہیں۔ شام کو کھیتوں میں تفریح کر رہے ہیں۔ بارش کے زمانے میں تالابوں اور ندیوں میں کود کود کر نہا رہے ہیں۔

آج مدت کے بعد دو بچھڑے ہوئے ساتھی گلے مل رہے تھے۔ چاکو میاں اب بہت بدل چکے تھے۔ غم جاناں سے بڑھ کر غم دوراں نے انہیں کچھ کچھ متین۔ سنجیدہ اور فکر مند بنا دیا تھا اب وہ پہلی سی بات نہ رہی تھی۔ چاکو میاں کی باتوں میں ظرافت سے زیادہ جگہ سنجیدگی نے لے لی تھی۔ اگر ہم میں سے کوئی کہتا کہ چاکو میاں تمہارے لئے تو یہ حلوہ پکا ہی نہیں۔؟ چاکو میاں ایک سنجیدہ مسکراہٹ کے ساتھ دو تین بار سر کو ہلا کر "ہوں" "ہوں" کہتے اور دھیرے دھیرے حلوے کی پلیٹ کی طرف ہاتھ بڑھاتے

گھر میں ہماری آمد سے سب کو بہت خوشی ہوئی خصوصاً ہمارے بڑے بھائی جن کے یہاں ہم ٹھہرے تھے اور ہماری بہن جو ہماری بھاوج بھی تھیں۔ بہت خوش تھیں ہم جلد جلد نہائے کپڑے بدلے۔ ناشتہ کیا

Marfat.com

اور یوم آزادی کا جلوس دیکھتے مال روڈ چلدیئے۔

آج میں پورے تیرہ برس کے بعد دوبارہ مال روڈ پر وائی۔ ایم سی۔ اے (Y.M.C.A) کے سامنے کھڑا تھا۔ یہ جگہ بنک اسکوائر کہلاتی ہے۔ سامنے الہ آباد بنک اور لائیڈز بنک کی عمارتیں تھیں اور پشت پر وائی۔ ایم۔ سی۔ اے کی گہرے کتھئی رنگ کی عمارت تھی۔ ہم دھوپ میں کھڑے تپ رہے تھے۔ ہمارے ساتھ ہزاروں تماشائین حضرات کی بھی یہی حالت تھی۔ گرمی۔ گھٹن۔ دھوپ۔ پسینہ۔۔۔۔ مگر ہم شوق دید میں کھڑے تھے۔ بہت انتظار کے بعد جلوس نکلنا شروع ہوا۔ بکتر بند گاڑیاں۔ ٹینک۔ چھوٹے ٹینک۔ بڑے ٹینک توپیں۔ اینٹی ایئر کرافٹ گن۔ پیدل فوج۔ بری۔ بحری اور ہوائی فوج۔۔۔۔ کوئی دو گھنٹے تک مسلسل جلوس نکلتا رہا۔ جلوس ختم ہوگیا۔ بھیڑ میں سب ہمراہی بچھڑ گئے۔ صرف میں اور چاکو میاں ساتھ رہ گئے۔ گرمی اور پیاس کے مارے برا حال تھا۔ میں نے کہا "چاکو میاں کچھ پئیں گے"

انارکلی کے نکڑ پر ہم دونوں نگینہ بیکری میں گھس گئے نگینہ بیکری صحافتوں کا اکھاڑہ ہے۔ یہاں بڑے بڑے پہلوان لنگر لنگوٹا کسے آتے ہیں۔ لیگی۔ احراری۔ کانگریسی۔ جماعت اسلامی کے کارکن۔ کمیونسٹ سوشلسٹ۔۔۔۔ ترقی پسند۔ دقیانوسی۔ ادیب۔ شاعر۔ افسانہ نگار تنقید نگار سوٹڈ بوٹڈ جنٹیل۔ کٹر ملا۔ سب ہی آتے ہیں۔ چائے کے دور چلتے ہیں۔ گھنٹوں بحثیں ہوتی ہیں۔۔۔۔ چھوٹی سی جگہ ہے۔ ہوا

Marfat.com

گھٹتی ہے۔ بجلی کا پنکھا بھی ایک ہی ہے۔ ایک قسم کی تلخ سی بو آتی رہتی ہے مگر پھر بھی لوگ آتے ہیں۔ کلب کا سالطف اٹھاتے ہیں اور گپیں ہانکتے ہیں ۔۔۔ ہم نے بھی دو گلاس لیمن کا آرڈر دے دیا۔ ہم لیمن پیتے رہے۔ چاکو میاں سفر کے اور اِدھر اُدھر کے حالات پوچھتے رہے۔ یہاں سے اٹھ کر ہم انارکلی بازار میں گھس گئے۔ بازار زیادہ چوڑا نہیں ہے۔ اس لئے یک طرفہ (ONE WAY) ٹریفک چلتی ہے۔ بڑا پُر رونق بازار ہے

"یہ بھلے دی ہٹی تھی۔ وہ کرنال شاپ ہے" چاکو میاں بتاتے جاتے تھے "یہ بیلی رام کا دواخانہ ہے۔ کہتے ہیں جب لوگ اس دواخانے کو آگ لگانے آئے تو بیلی رام نے لوگوں سے کہا، لگادو آگ ۔۔۔ اتنا بڑا دواؤں کا اسٹاک ملک بھر میں نہ ملے گا۔ سب بیمار ہو ہو کر مر جاؤ گے" لوگ واپس چلے گئے۔

تاریخ کا یہ پہلا واقعہ ہے کہ مجمع نے کوئی بات مان لی ہو ۔۔۔ نہیں تو ۔۔۔ مجمع کا کوئی دماغ نہیں ہوتا اس کے دماغ میں غنڈ گیت سمائی ہوتی ہے۔ اور غنڈ گیت ۔۔۔؟ غنڈ گیت کا کوئی مذہب نہیں ہوتا کوئی اخلاق نہیں ہوتا۔ کوئی قانون نہیں ہوتا ۔۔۔!)

ہم پیسہ اخبار، اسٹریٹ سے ہو کر موہن لال روڈ پر نکل گئے۔ اس موہن لال روڈ پر ہی کیا منحصر ہے۔ لاہور کے گلی کوچوں میں طابع و ناشر، پرنٹرز اینڈ پبلیشرز کے بورڈ نظر آئیں گے۔ کراچی میں ولیڈ یز اینڈ جینٹس ٹیلرز، سول اینڈ ملٹری ٹیلرز، رمضان دین ٹیلرز آرمی اینڈ

Marfat.com

نیو ی کنسٹرکٹر، بدھو شاہ اینڈ کو اسپیشل لیڈیز ڈریس میکر۔ زینے کے نیچے، فٹ پاتھ پر لکڑی کے کیبن میں، ٹاٹ کے پردوں میں گلی کے نکڑ پر سول اینڈ ملٹری ٹیلر صاحب، جو نا مارکیٹ سے یا نیلام سے خریدی ہوئی مشین چلا رہے ہیں۔ رنگ برنگ کا کپڑا ان کی آنکھوں کے سامنے سے پھسل رہا ہے۔ سل رہا ہے۔ زیب تن ہو رہا ہے۔ کراچی میں درزیوں کے بعد، سبحان اللہ ہوٹل، ماشاء اللہ کیفے توکل ہوٹل، اللہ کی رحمت کا محمدی ہوٹل کا نمبر آتا ہے۔ لاہور میں ویرستان بک ایجنسی، نئی کتابی دنیا، کالج اینڈ اسکول بک اسٹال، دفتر رسالہ عاشقستان ۔ ۔ ۔ ۔ اور جانے کیا کیا؛ پتلی پتلی تنگ گلیوں میں چھاپے خانے ہیں۔ چھپائی ہو رہی ہے۔ ایک طرف جلدیں تیار ہو رہی ہیں کاغذ کی کترنوں کا ڈھیر ہے۔

ہم گھر آ گئے کھانا کھایا اور سو گئے۔ شام کو نہائے۔ چائے پی اور لارنس گارڈن چل دیئے۔ لارنس گارڈن افسانوی دنیا میں اور اختر شیرانی کی نظموں اور غزلوں میں آ کر حیات جاوید حاصل کر چکا ہے۔

ہم گورنمنٹ کالج کے چوراہے سے چیئرنگ کراس کا ٹکٹ لے کر بس میں بیٹھ گئے۔ بسوں میں سیٹوں کی ترتیب زیادہ اچھی نہیں ہے اس کے علاوہ بھیڑ بکریوں کی طرح سواریاں بھرلی جاتی ہیں۔ کراچی میں ایسا نہیں ہے جتنی سیٹیں ہوتی ہیں اتنی سواریاں بٹھاتے ہیں اور بسوں کا انتظام بھی قدرے اچھا ہے۔ ہماری بس گول باغ میں ہو کر جا رہی

Marfat.com

تھی ۔۔ ترکوں کی توپ ۔ یہ توپ انگریزوں نے ترکوں سے کسی جنگ
میں چھین کر یہاں رکھ دی ہے ۔ لاج پت رائے کا مجسمہ ۔ لالہ جی کا مجسمہ
اب یہاں نہیں رہا جس چبوترے پر مجسمہ نصب تھا وہ باقی رہ گیا ہے ۔
لالہ جی اب شملہ میں رِج RIDGE پر براجمان ہیں ۔ ۔ زمزمہ یا بھنگیوں
والی توپ ۔۔ وُلنر کا اسٹیچو ۔ ڈپلومہ گون پہنے ۔ سنجیدہ ۔ متین پُروقار
کسی گہری سوچ میں غرق ۔۔ پرنسپل وُلنر ۔ آپ سنسکرت کے بہت
بڑے عالم اور مستشرق تھے ۔ پنجاب یونیورسٹی کے وائس چانسلر اور فیلو
بھی تھے ۔ آپ کی پُشت پر ' وُلنر ہال'، اور کسی تجربہ گاہ کی عمارتیں ہیں ۔
اور سامنے لاہور آرٹس اسکول اور میوزیم ہے، یونیورسٹی ہال، ۔۔
مارکیٹ، انڈیا کافی ہاؤس نام کا تو کافی ہاؤس ہے ۔ مگر علمی ۔ ادبی
کلب ہے، وائی ۔ ایم ۔ سی ۔ اے، پبلک اسکوائر، جی ۔ پی ۔ او، ہائی
کورٹ، فیڈرل کورٹ ۔ لارنس کا مجسمہ ۔ لارنس ۔ فاتح پنجاب ۔
ایک ہاتھ میں قلم ۔ ایک ہاتھ میں تلوار ۔" میں تم پر قلم اور تلوار سے حکومت
کروں گا" ۔ یہ ہی لارڈ ۔ میرے آقا ۔ ؟ تمہاری تلوار کی حکومت ختم ہو
چکی ہے میں چاہتا ہوں کہ تم بھی اپنا بوریہ بستر باندھ کر واپس چلے
جاؤ ۔ دور ۔ سات سمندر پار ۔ جہاں سے آئے تھے ۔ وہیں !! اب
ہم آزاد اور خود مختار ہو کر اور مزید تمہاری ناک کان کاٹ کر تمہاری
بے عزتی نہیں کرنا چاہتے "۔ ایک ہفتے بعد میں نے " امروز" میں پڑھا
کہ لارنس کا بت ہٹا دیا گیا ہے ۔ اخبار سول اینڈ ملٹری گزٹ کا آفس،

Marfat.com

ریگل سینما، چیرنگ کراس — ہم بس سے اُتر گئے۔ تھوڑی دور پیچھے — سفید عمارت اسمبلی ہال کی ہے۔ سامنے وکٹوریہ[1] کا مجسمہ ہے۔ وکٹوریہ کے مجسموں میں سب سے زیادہ خوبصورت کراچی میں وفیر ہال، کا ہے جو عہد شباب کا ہے اور جہاں جہاں بھی میری نظر سے گذرے وہ سب بڑھاپے کے تھے۔ یہ بھی بڑھاپے کا ہے۔

ہم چڑیا گھر کے سامنے سے ہوتے ہوئے لارنس گارڈن میں داخل ہو گئے۔ یہ پنجاب یونیورسٹی کا نباتاتی باغ BOTANICAL GARDEN بھی ہے۔ درختوں پر ان کے نام لکھے ہیں۔ بڑے گھنے اور اونچے لمبے درخت ہیں۔ باغ کے درمیان میں دو تین چھوٹی چھوٹی پہاڑیاں اُگی ہیں۔ جن پر ٹیڑھے میڑھے، اونچے نیچے راستے بنے ہیں ایک پہاڑی پر OPEN AIR THEATRE (کھلا تھیٹر) بھی بنا ہے۔ کھیلوں کے میدان اور بڑے بڑے افسروں اور امیروں کے لئے ایک کلب بھی ہے۔

گلستانِ فاطمہ۔ باغ کا سب سے زیادہ حسین گوشہ ہے گھاس بڑی دبیز اور نرم ہے معلوم ہوتا ہے کہ زمین پر سبز مخملیں قالین بچھا دیئے ہیں۔ ایک گول دائرہ نما دروازے سے ہو کر ایک فوارہ ہے — شام کے تھکے ہارے سورج کی سنہری کرنیں جب فوارے پر پڑتی ہیں تو نہایت حسین، چھم چھم، کا منظر آنکھوں میں پھر جاتا ہے معلوم ہوتا ہے کہ کوئی حسین و مہ جبیں رقاصہ محو رقص ہے۔

گلستان رسٹورنٹ، میں پاکستانی آرکسٹرا (رباب) بج رہا تھا۔

---

[1] وکٹوریہ کا یہ مجسمہ بھی ہٹا دیا گیا۔

Marfat.com

ایک جدت پیدا کی گئی تھی۔ ساز کے ساتھ گھنگروؤں کی جھنکار بھی سنائی دیتی تھی جو رقص کا احساس دلاتی تھی۔

ہم شام کو واپس ہوئے آج یوم آزادی کا چراغاں تھا۔ ایسی خوشی کے موقع پر مال روڈ معلوم نہیں کیوں اداس اور غمگین معلوم ہو رہی تھی سرکاری عمارتوں پر تو روشنی کی گئی تھی مگر دوسری عمارتوں پر بہت کم روشنی تھی۔ آج سے تیرہ سال پہلے۔ جارج ششم کی تاج پوشی کے دن مال روڈ پر جو روشنی اور سجاوٹ کی گئی تھی وہ مجھے آج بھی یاد تھی۔

ہم پیدل پھرتے ہوئے انارکلی پہنچے۔ آج 'انارکلی' کی برات تھی۔ انارکلی دلہن کی طرح سجی ہوئی تھی۔ بقعۂ نور بنی تھی۔ سارے بازار پر جھنڈیوں سے چھت سی بن گئی تھی۔ پیدل چلنا دشوار تھا۔ ہم کافی دیر تک گھومتے رہے پھر گھر آ گئے

آج آفس کا دن تھا اس لئے چچا کو میاں اور بھائی، آفس چلے گئے ہیں اور ممو بھیا گھر پر رہ گئے۔ چار بجے شاہدرہ جانے کا پروگرام بن چکا تھا۔ ہم سب بس میں شاہدرہ روانہ ہوئے۔

ہماری بس سرکلر روڈ پر بھاٹی گیٹ۔ ٹکسالی گیٹ ہوتی ہوئی شاہی مسجد کے عظیم الشان عمارت کا چکر لے کر حضوری باغ سے گزر کر جا رہی تھی۔ منٹو پارک اور راوی روڈ ہوتی ہوئی راوی کے پل میں داخل ہو گئی۔ دریا چڑھا ہوا تھا۔ دور تک پانی ہی پانی نظر آتا تھا۔ دریا کے دونوں کنارے انتہائی سرسبز تھے۔ دوسری طرف ریل کا پل تھا۔ راوی کا پل گذر

Marfat.com

جانے کے بعد ہم اس سڑک کے نکڑ پر اتر گئے جو اصل مقبرے کو جاتی تھی مقبرے کے دروازے پر ہم نے نا کلیں خریدیں اور ان میں نمک مرچ چھڑکوالیا ۔ ہم نے شہر سے انگور بھی خرید لئے تھے ۔

ہم ایک پارک اور دروازے سے نکل کر ایک خوشنما باغ میں پہنچے ۔ سامنے جہانگیر کا مزار تھا ہم جوتے اتار کر مزار کے اندر چلے گئے ۔ مزار میں کافی تاریکی سی تھی ۔ قبر پر خدا کے ننانوے نام کندہ تھے ۔ یہاں ہم تھوڑی دیر ٹھہرے پھر باہر نکل آئے اور چھت پر چڑھ گئے ۔ منار پر چڑھ کر ہم اطراف کا منظر دیکھ رہے تھے ۔ دور شاہی مسجد کے تین منار نظر آتے تھے ۔ سامنے راوی شاہدرہ کا چکر لگا کر سانپ کی طرح بہا جا رہا تھا ۔ ریل اور پختہ سڑک کے پل صاف نظر آ رہے تھے ۔ قریب ہی پشاور جانے والی ریل کی لائین چمک رہی تھی ۔ شاہدرہ باغ اسٹیشن دھنواں اڑاتا ہوا دیا سلائی کا کارخانہ ۔ پشت پر شاہدرہ شہر ۔ اور افق پر پھلانا ہوا سورج ...... ایک منار عورتوں کے لئے مخصوص تھا نذر لالانِ لاہور نے کچھ ایسی حرکتیں کی تھیں ۔ جن کی وجہ سے یہ تخصیص کرنا پڑی .....

شاہدرہ اور شاہی مسجد کے مناروں میں کوئی ایسی صنعت رکھی ہے کہ اگر شاہی مسجد کے کسی منار سے شاہدرے کے منار دیکھیں تو صرف تین منار نظر آئیں گے اور ایک غائب رہے گا ۔ اسی طرح شاہدرے سے شاہی مسجد کے تین منار نظر آئیں گے اور ایک چھپ جائے گا ہمیں بھی شاہی مسجد کے صرف تین منار نظر آ رہے تھے ۔

Marfat.com

ہم نے مزے لے لے کر انگور اور نمکین تاخیں کھائیں اور کافی دیر تک گپیں ہانکتے رہے۔ اندھیرا ہو چلا تھا۔ اس لئے نیچے اتر آئے اور آصف خاں کے مزار میں گھس گئے۔ مزار کے گنبد پر گدھ اور چمگادڑیں بیٹھی تھیں۔ بڑی پُر ہول اور ڈراونی جگہ تھی۔ چاروں طرف بڑی بڑی گھاس کھڑی تھی۔ باہر نکلنے کا دوسرا راستہ کانٹے لگا کر بند کر دیا گیا تھا۔ ہم کانٹے ہٹا کر بڑی مشکل سے باہر نکلے اندھیرا ہو جانے کی وجہ سے نور جہاں کے مزار پر نہ جا سکے اور گھر چلے آئے۔

آج ہم میوزیم دیکھنے گئے عمارت خوبصورت اور شاندار تھی۔ دروازے میں داخل ہوتے ہی ایک طرف کپورتھلہ کی مسجد کا ماڈل اور دوسری طرف امرت سر کے سنہری مندر کا ماڈل رکھا تھا۔ ہم تقریباً دو گھنٹے تک میوزیم دیکھتے رہے۔

میوزیم میں اکثر اشیاء بڑی نادر اور قیمتی ہیں۔ موہن جوڈارو اور ہڑپا کی چیزیں رکھی ہیں۔ یہاں بھی تصویروں کا اچھا خاصا ذخیرہ ہے مگر لکھنو کے میوزیم سے زیادہ اچھا نہیں ہے۔ یہ میرا ذاتی خیال ہے کہ وہ میوزیم جو میں اب تک دیکھ چکا ہوں ان میں کلکتہ کے میوزیم کے بعد جے پور کا میوزیم بہ لحاظ عمارت اور ذخیرہ سب سے اچھا ہے

میوزیم کے پاس ہی لاہور آرٹس اسکول تھا جو تعطیلات کے سبب بند تھا۔ اب ہمیں پنجاب سکریٹریٹ میں 'انارکلی' کا مزار دیکھنا تھا وہاں ہمارے ایک بھائی ملازم تھے، انہوں نے دکھانے کا وعدہ کر

Marfat.com

لیا تھا۔ مزار سکریٹریٹ کے احاطے کے اندر آگیا ہے اس لئے عام لوگ جانتے بھی نہیں۔

ہم بھائی کو ڈھونڈتے ہوئے ان کے آفس پہنچے۔ وہ ساتھ ہو گئے۔

سکریٹریٹ کے بالکل پیچھے ایک بڑی خوبصورت سفید عمارت ہے یہی بدنصیب انارکلی، کا مزار ہے جو کھلنے بھی نہ پائی تھی کہ مرجھا کے رہ گئی۔

یہاں درمیانی ہال میں پنجاب کے گورنروں کی تصاویر قدیم کی ہوئی دیواروں پر آویزاں تھیں۔ اس کے علاوہ پنجاب کی مشہور جنگوں کی تصاویر بھی دیواروں پر اور لکڑی کے اسٹینڈوں پر لگی تھیں۔ صلح ناموں۔ عہدناموں اور اہم خطوط کے مجموعے بھی رکھے تھے۔ چھوٹا سا تاریخی میوزیم تھا۔

انارکلی کی قبر کا تعویذ اپنی اصل جگہ یعنی درمیانی ہال، سے ہٹا کر ایک جھروکے کے نیچے رکھ دیا تھا۔ اصل قبر تہہ خانے میں تھی جو تعویذ تھا تعویذ پر نہایت اعلیٰ نقش و نگار پتھر میں کھود کر بنائے گئے تھے۔ مسٹر الیسٹوک کی یہ رائے ایک تختی پر درج تھی۔ اور ساتھ میں یہ عبارت بھی۔

"یہ تعویذ دنیا میں سنگتراشی کے بہترین نمونوں میں سے ہے"

نادرہ بیگم یا شرف النساء بیگم عرف انارکلی شہنشاہ اکبر کے حرم سرا کی ایک کنیز تھی۔ جس پر جہانگیر ایام شہزادگی میں دل و جان

Marfat.com

سے فریفتہ تھا۔ اور وہ بھی شہزادے پر جان و دل سے نثار تھی جب اکبر کو اس بات کا علم ہوا تو اس نے غصّے میں آکر بیچاری انارکلی، کو زندہ دیوار میں چنوا دیا۔ جہانگیر اس وقت باپ کے ڈر سے خاموش ہو گیا مگر بعد میں شہنشاہ ہوتے پر اپنی بدنصیب محبوبہ کی یاد میں یہ حسین و جمیل مقبرہ تعمیر کرا دیا۔

"تا قیامت شکر گویم کردگارِ خویش را
آہ! اگر من باز بینم روئے یارِ خویش را"

"(مجنوں سلیم اکبر)"

اس واقعہ کی تاریخی نوعیت کچھ ہی ہو مگر بڑا دردناک، حسرت انگیز قصہ ہے۔ ہم کافی دیر تک تصاویر۔ صلح نامے اور نایاب خطوط دیکھتے رہے پھر گھر آ گئے۔

شام کو ہمیں پرانے شہر میں کسی سے ملنے جانا تھا۔ ہم نہایت تنگ و تاریک، پُر پیچ۔ گندی اور سیلی ہوئی گلیوں میں سے جا رہے تھے کہیں کہیں فسادات کی تباہی میں مکان گر گئے تھے اور اونچے اونچے مکانوں کے درمیان میدان سے آجاتے تھے۔ ہم مختلف گلیوں میں ہو کر ملاقاتی صاحب کے مکان تک پہنچے۔ بڑے تاریک اور قدیم طرز کے مکان میں صاحب موصوف رہتے تھے۔ صاحب تو نہ تھے مگر بیگم صاحبہ سے ملاقات ہوئی۔ کافی خاطر کے بعد ہم رخصت ہوئے۔

اب کی ہم ایک دوسرے راستے سے واپس ہوئے۔ ہم ایک بازار میں

Marfat.com

جا رہے تھے۔ یہ بازار یہاں کا "فارس روڈ"... "سونا گاچی" تھا۔ طبلے پر تھاپ پڑ رہی تھی۔ پائل کی مست جھنکار فضا میں گونج گونج کر بکھر رہی تھی۔ نوٹ برس رہے تھے۔ بڑی چہل پہل اور رونق تھی۔

ہم نے پورے بازار کا چکر لگایا اور ایک دوسری گلی میں گھس گئے۔ نہایت تنگ و تاریک۔ گندی اور غلیظ۔ تعفن آلود سیلی ہوئیں۔ دورویہ کوٹھریاں بنی تھیں۔ کہیں مٹی کے تیل کے دیئے۔ کہیں موم بتی اور کہیں پانچ نمبر کا بلب ٹمٹما رہا تھا اور شوکیس SHOW CASE میں ایک چینی کی گڑیا بیٹھی تھی۔

ہم اس گندی، تاریک اور متعفن گلی میں سجی ہوئی دوکانیں دیکھتے ہوئے جا رہے تھے "اُف! بڑی گرمی ہے"، ایک شخص قمیص کے دامن سے ہوا کرتا ہوا ہمارے قریب سے گذر گیا۔

یہ پُرپیچ، تاریک اور بدبو دار گلیاں... کوئی انہیں صاف نہیں کراتا۔ کوئی ان میں بجلی کے سیمابی قمقمے نہیں لگوا دیتا۔ تاکہ یہ روشن ہو کر جگمگا اُٹھیں۔ بیچارا ساحر انہیں گلیوں میں مارا مارا پھرتا تھا۔ یہ اندھیرا۔ یہ تاریکی یہ گندگی، یہ غلاظت۔ یہ بدبو۔ یہ سیلن۔ یہ گھٹن اُس سے برداشت ہو نہ سکی۔ اس کی چھاتی پھٹ گئی۔ اور وہ چلّا اٹھا۔

مدد چاہتی ہے یہ حوّا کی بیٹی      یشودھا کی ہم جنس رادھا کی بیٹی

یہاں حضرت حوّا کی بیٹی. یشودھا اور رادھا کی پُتری. وہ جان کائنات رہتی تھی۔ جس کی تخلیق فطرت کا اعلیٰ شاہکار ہے۔

ہم نے چاکو میاں کو پٹی پڑھائی "چاکو میاں! ایک دن کی چھٹی او

Marfat.com

پھر واہگہ چلیں۔ اور اگر چھٹی نہ ملے تو پھر پیٹ میں درد ہونا چاہیئے ۔؟"
چاکو میاں پیٹ کے درد کے لئے تیار ہو گئے " آفس جانے کے ایک دو گھنٹے بعد پیٹ پکڑ کر بیٹھ جاؤں گا۔ بس ۔ چھٹی یقینی ہے " چاکو میاں نے چکمہ دے دلا کے چھٹی حاصل کر لی اور ہم لوگ اسٹیشن سے واہگہ جانے والی بس میں بیٹھ گئے ۔ ہم جس سڑک پر جا رہے تھے اس پر اقبال کا مکان بھی آتا تھا۔ معمولی سادا سا مکان تھا۔

ہم ریلوے پل پر سے گذرے پل کے نیچے لائنوں کا جال بچھا تھا اور مغلپورہ ورکشاپ کے شیڈ دور تک پھیلے ہوئے تھے ۔ مغلپورہ اور باغبان پورہ ہوتی ہوئی ہماری بس شالامار باغ کے سامنے سے گذر گئی۔ ہم امرتسر کی طرف جا رہے تھے ۔ سڑک کے دونوں طرف سایہ دار درخت لگے تھے اور کہیں کہیں فیکٹریاں بن رہی تھیں ۔

ہماری بس "باٹا پور" کی چار دیواری کے سامنے سے گذری ۔ سفید چار دیواری پر انگریزی اور اردو میں بڑے دلچسپ مقولے لکھے تھے " ابھی دنیا کو نیتی ارب جوتوں کی ضرورت ہے " یہ مجھے سب سے زیادہ دلچسپ لگا جو یاد رہ گیا۔

باٹا پور میں "باٹا" کے مشہور جوتے بنتے ہیں ۔ ہمارا ارادہ فیکٹری دیکھنے کا تھا۔ مگر فیکٹری میں اسٹرائیک ہو رہی تھی ۔ اس لئے ارادہ ملتوی کر دینا پڑا
باٹا پور اور جلو کے درمیان ایک نئی نہر نکالی گئی ہے نہر کافی گہری اور پختہ تھی ۔ یہاں سے واہگہ چار میل رہ جاتا تھا۔ جلو سے گذر کر یو دھر

Marfat.com

پولس کا ہیڈ کواٹر (۵ - ۱۴) آیا۔ اور ایک چھوٹی سی نہر کے پل سے گذر کر ایک جگہ بس ٹھہر گئی۔ یہ واہگہ تھا۔ سڑک کے کنارے ایک طرف خیمہ لگا ہوا تھا جہاں پاسپورٹ کی دیکھ بھال ہوتی تھی ہمیں اصل سرحد سے دو فرلانگ ادھر ہی روک دیا گیا۔ ہم لوہے کی ایک بیریر پار کر رہے تھے۔ کہ پولیس والے نے کہا "ٹھہر جائیے۔ آگے نہیں جا سکتے۔"؟

ہمیں بڑا تاؤ آیا۔ ہم خیمے کے اندر گئے معلوم ہوا جس جگہ ہمیں روکا گیا تھا وہاں سے اور اصل سرحد تک NOMAN LAND یا مشترکہ زمین تھی جس میں ہندوستانی باشندے بھی آ جا سکتے تھے۔ اس مشترکہ زمین میں جانے کے لئے اجازت نامہ حاصل کرنا پڑتا تھا۔ اس لئے ہم مجبور تھے۔ دُور سے ہمیں دو جھنڈے نظر آ رہے تھے۔ ایک پاکستانی۔ دوسرا ہندوستانی

ہم پھر اسی بس میں آکر بیٹھ گئے جس سے آئے تھے اور واپسی میں شالامار باغ کے دروازے پر اتر گئے۔

شالامار۔ لاہور کی بہترین سیرگاہوں میں سے ایک ہے ہماری قسمت سے اس وقت فوارے چل رہے تھے نہیں تو عام طور سے بند رہتے ہیں۔ دھوپ میں چھما چھم، پریاں ناچ رہی تھیں۔ دو رنگ پریاں ہی پریاں ....

ہم بارہ دری میں پہنچے بارہ دری کے نیچے ایک مصنوعی جھرنا بہتا ہے اور جھرنے کے سامنے سنگ مرمر کا ایک تخت بچھا ہے جس کے نیچے سے جھرنے کا پانی بہہ کر ایک بڑے حوض میں گرتا ہے اور حوض کے بیچ

Marfat.com

میں ایک تخت گاہ بنی ہے۔ جس پر دو راستے دونوں طرف سے گئے ہیں۔

ہم نے جھرنے میں ہاتھ پیر دھوئے۔ مجھے مذاق سُوجھا میں سنگ مرمر کے تخت پر اکڑ کر بیٹھ گیا اور پر رُعب اور گرجدار آواز میں چِلّایا۔

"مہابت خان ۔۔؟! ہم بدولت حکم دیتے ہیں۔ کہ آصف خان کو گرفتار کیا جائے اس نے ہمارے خلاف بغاوت کی ہے۔"

"جہاں پناہ کا جو حکم"! ۔ چاکو میاں نے ہاتھ باندھ کر نیچی نگاہ کر کے نہایت ادب سے کہا "اعلیٰ حضرت کے حکم کی پوری پوری تعمیل کی جائے گی"!

ایک شہنشاہ نے دولت کا سہارا لے کر

ہم غریبوں کی محبت کا اُڑایا ہے مذاق

شاہ جہاں نے دولت کا سہارا لے کر تاج، بنوایا اور غریب ساحر کی محبت کا مذاق اُڑایا مگر آج میں اس تخت کا سہارا لے کر شاہ جہاں کے باپ جہانگیر کی عظمت کا۔ اس کی حکومت کا، اس کی شہنشاہیت کا مذاق اُڑا رہا تھا منہ چڑا رہا تھا۔ مسخرہ پن کر رہا تھا۔

ممو بھیا نے تالی پیٹی "واہ! واہ!! واہ! واہ

اور چاکو میاں تخت پر دھم سے کود پڑے۔ یہ منہ اور مسور کی دال ڈراپ سین ہو گیا۔

ہم نے طے کر لیا کہ اب شام تک گھر نہ جائیں گے۔ اس لئے باغ سے باہر آ گئے۔ لسّی کی دوکان پر لسی پی نا غیں اور امرود خرید کر خوب نمک مرچ چھڑکوایا اور ایک ٹوٹے ہوئے بُرج پر بیٹھ گئے۔ مزے لے لے کر

Marfat.com

بہ چیٹ پٹی ناچیں اور امرود کھائے۔ حوض کے کنارے ایک پارہ دری میں پکے فرش پر بغیر کچھ بچھائے لیٹ کر سو گئے۔ عصر کو حوض کے اونٹنے ہوئے پانی سے ہاتھ منہ دھوتے اور اس جگہ بیٹھ گئے جہاں بڑے حوض کا پانی چراغاں میں گرتا ہے

چراغاں کے چھوٹے سے حوض میں کہیں سے بھولی بھٹکی ایک مچھلی آگئی چند چھوٹے بچے اس کے پیچھے پڑ گئے۔ مجھ سے بھی نہ رہا گیا۔ میں بھی جوتے اتار۔ پینٹ کے پائنچے چڑھا حوض میں اتر گیا۔ کئی مرتبہ پھسلن کی وجہ سے گرتے گرتے بچا۔ آخر حوض کے فوارے بند کر دیئے۔ پانی کم ہو گیا اور مچھلی ایک بچے نے پکڑ لی۔

اب شام ہو چکی تھی ہم گھومتے پھرتے باغ سے نکل آئے اور بس میں بیٹھ گئے۔ اگلی ہماری بس مغلپورہ ورکشاپ کے درمیان سے ہو کر جا رہی تھی۔ دونوں طرف ملازموں کے مکان اور بڑے افسروں کے بنگلے بنے تھے۔ ہم شام کو گھر پہنچے،

آج جمعرات تھی کھانا کھانے کے بعد میں اور چاکو میاں داتا گنج بخش چل دیئے۔ مزار پر بڑا ہجوم تھا۔ دروازے پر لنگڑے لولے اپاہج فقیر جمع تھے۔ "داتا تمہاری مراد پوری کرے۔ دو خدا کی راہ پر" ہم جوتے اتار کر اندر گھس گئے،

مزار میں ایک جالی دار کوٹھری بنی ہے جو چلہ کہلاتی ہے۔ کہتے ہیں خواجہ معین الدین چشتیؒ نے اس کوٹھری میں چالیس دن کا چلہ کھینچا تھا۔ داتا کی قبر کے چاروں طرف بھی جالی لگی ہے۔ ایک طرف دروازہ ہے

Marfat.com

جس میں سے ہار پھول اور 'چڑھاوا' چڑھاتے ہیں۔

مرد۔ عورتیں۔ بچے۔ بوڑھے۔ جوان۔ معتقد آتے تھے۔ قبر کو چھوتے پھر وہی ہاتھ آنکھوں میں ملتے۔ ایک صاحب قبر کی طرف منہ کئے ہوئے باقاعدہ نماز پڑھ رہے تھے۔ کئی ایسے تھے جو قبر کی جانب منہ کئے ہوئے قرآن شریف پڑھ رہے تھے۔

کالے اور سفید برقعوں میں نقابیں اٹھائے ہوئے۔ نقابیں کرائے ہوئے پردے دار۔ بے پردہ کم سن۔ نوجوان۔ بڑی بوڑھی عورتیں چاروں طرف بیٹھیں عبادت میں مشغول تھیں کوئی وظیفہ پڑھ رہی تھی کوئی مراقبے میں بیٹھی تھی۔ یہی حال مردوں کا بھی تھا۔ ایک طرف محفل قوالی جمی تھی۔ قوال ڈھول پیٹ پیٹ کر گا رہے تھے۔ اور سامعین سے خراج تحسین وصول کر رہے تھے۔

قبر کے پیچھے پتھر کا ایک بڑا پیالہ رکھا تھا جس میں داتا کی قبر دھو کر وہی پانی جمع کر دیا جاتا تھا۔ لوگ آتے اور پانی کو متبرک سمجھ کر اپنی آنکھوں میں لگاتے اور چہرے پر ملتے ہم لوگ گھوم پھر کر واپس آگئے۔

جمعہ کی وجہ سے افسوں میں آدھا دن HALF DAY تھا اس لئے ہم ماڈل ٹاؤن، بڑے بھائی کے ایک دوست سے ملنے گئے جو ممو بھیا کے استاد بھی رہ چکے تھے۔

ماڈل ٹاؤن جانے کے لئے علیحدہ بس سروس قائم تھی۔ ہر آدھ گھنٹے کے بعد ایک بس آتی تھی۔ اور دوسری جاتی تھی۔ ہم ماڈل ٹاؤن میں

Marfat.com

اسٹینڈ سے بس میں بیٹھ گئے۔ ہماری بس میو ہاسپٹل کے قریب سے گذری۔ مال روڈ کا چوراہا آیا۔ ریگل سینما کے بعد سر گنگارام میموریل ہاسپٹل آیا۔ ہاسپٹل کی دوسری طرف فاطمہ جناح میڈیکل کالج کی عمارت بن رہی تھی۔ بس اچھرہ سے گذر کر اور میاں میر کی نہر پار کر کے قصور جانے والی سڑک پر جا رہی تھی۔ سڑک کے دونوں طرف فیکٹریاں تھیں کچھ بند پڑی تھیں اور کچھ چل رہی تھیں۔ گارڈن ٹاؤن سے آگے بڑھ کر ہماری بس ماڈل ٹاؤن میں داخل ہو گئی۔

یہ نہایت سرسبز اور شاداب خطہ ہے درمیان میں ایک گول دائرہ ہے۔ دائرے کے چاروں طرف آٹھ بلاک بنائے ہیں اور ہر بلاک کو پلاٹوں میں تقسیم کر کے جدید اور نئے ڈیزائن کی کوٹھیاں بنائی ہیں۔ ہر بلاک میں سیدھی سیدھی سڑکیں ہیں اور ہر سڑک دائرے کو براہ راست . . . چھوتی ہے دائرے کے اندر کھیلوں کے میدان، ہسپتال، ڈاک خانہ، کلب گھر، لڑکے اور لڑکیوں کے لئے علیحدہ علیحدہ ہائی اسکول بنے ہیں۔ بس دائرے کا پورا چکر لگاتی ہے اور ہر بلاک کے سامنے جہاں اس بلاک کا نام بورڈ پر لکھا ہوتا ہے ٹھہرتی ہے اور مسافروں کو لے کر جس راستے سے آتی ہے اس سے واپس ہو جاتی ہے۔

ہم (B) بی بلاک پر اتر گئے اور صاحب موصوف کی کوٹھی پر پہنچے موصوف ٹریننگ کالج میں لیکچرار تھے۔ نہایت سادا۔ بے تکلف اور

Marfat.com

ہنس مکھ انسان تھے۔ ہم سے بڑی خندہ پیشانی سے ملے۔ تعلیم پر گفتگو چھڑ گئی اور بڑی دیر تک یہ گفتگو موضوع بحث رہی۔

چائے آگئی اور ہم چائے پی کر ماڈل ٹاؤن کی سیر کو نکل گئے۔ ہم پھرتے ہوئے (A) بلاک میں ماڈل ٹاؤن کی مسجد کے سامنے سے گذرے یوں تو مسجدیں ہزاروں دیکھی ہیں — چار منار، تین گنبد اندر پچی کاری یا سنگ تراشی کا کام، اور بیل بوٹے۔ مگر اس جیسی سادا خوبصورت اور جدید نمونے کی مسجد صرف ایک دیکھی ہے۔ وہ بھوپال میں احمد آباد کی جامع صوفیہ ہے جامع صوفیہ قسطنطنیہ کی جامع ایا صوفیہ کے نمونے پر بنائی گئی ہے نہایت حسین اور انوکھی معلوم ہوتی ہے صرف ایک منار ہے اور دو گنبد۔ مسجد میں مغرب کی نماز کا سلام پھرا تھا اور نمازی دعا مانگ رہے تھے۔ گنتی کے سات نمازی تھے۔ ایک امام۔ چھ مقتدی — !!

ہم دائرے نما سڑک پر جا رہے تھے اور موصوف ہمیں ماڈل ٹاؤن کے حالات بتا رہے تھے۔ یہاں کے بڑے دلچسپ قصے مشہور تھے۔ پناہ گزینوں نے بڑی دلچسپ حرکتیں کی تھیں۔ اپنی گایوں اور بھینسوں کو تو انہوں نے ڈرائنگ روم میں باندھا اور خود برآمدے میں پڑ رہے بجلی کا پنکھا بند نہ ہو سکا تو لاٹھی پھنسا کر بند کرنے کی کوشش کی۔ چلتے ریڈیو کو بھوت سمجھ بیٹھے۔

ہم نے تقریباً تین میل کا چکر لگایا درختوں اور پھولوں کی جھاڑیوں میں بڑی کثرت سے جگنو چمک رہے تھے معلوم ہوتا تھا کہ چھوٹی چھوٹی

Marfat.com

شمعیں جل رہی ہیں ـــــ دور تک جگ مگ ـ جگ مگ . . . .

ہم ماڈل ٹاؤن کے دروازے پر پہنچ گئے۔ یہ بسوں کا صدر اسٹیشن تھا۔ ہم رخصت ہوئے اور گھر آ گئے۔

اتوار کو قلعہ اور شاہی مسجد دیکھنے کا پروگرام بن چکا تھا۔ ہم پرانے شہر کی گلیوں میں ہو کر حضوری باغ پہنچے . . . یہ باغ شاہی مسجد کے صدر دروازے کے سامنے ہے۔ باغ کی دوسری جانب قلعے کا صدر دروازہ ہے جو سال ہا سال کے بعد اب ہر جمعہ کو کھلتا ہے۔ باغ کی شمالی سمت میں مہاراجہ رنجیت سنگھ کا مقبرہ اور گردوارہ ہے۔ باغ کے درمیان میں ایک بارہ دری بنی ہے۔ کہتے ہیں یہ بارہ دری شاہدرہ کی چھت پر بنی تھی۔ جسے سکھوں نے وہاں سے لا کر یہاں نصب کر دیا تھا۔ بارہ دری کافی خوبصورت ہے۔

شاہی مسجد کے صدر دروازے کی سیڑھیوں کے ایک پہلو میں اقبال کا مزار ہے اور دوسرے پہلو میں سر سکندر کی قبر۔

سنگ سرخ کی جدید ترین۔ نہایت حسین، چھوٹی سی عمارت ـــــ شاعر مشرق کی آخری آرام گاہ ہے۔ میں خوشی اور مسرت سے مسکرا رہا تھا کیوں کہ عمارت میں نقل۔ فرسودگی اور قدامت نہیں تھی۔ جیسا کہ عام طور پر مقبروں کے لیے مخصوص ہو کر رہ گیا ہے۔ ایک اونچا۔ گنبد اور درمیان میں قبر ـــــ ٹھٹھہ اور ملتان کے مقبرے تقریباً ایسے ہی ہیں۔ جن میں میرے نزدیک کوئی کشش ـ کوئی جدت۔ کوئی ندرت نہیں پائی جاتی۔

Marfat.com

تعویذ لحد عام طور پر جیسا ہوتا ہے ویسا ہی سنگ مرمر کا ہے
سرہانے کا کتبہ سفید پتھر کا ہے جس پر یہ اشعار کندہ ہیں۔

نہ افغانیم و نے ترک و تتاریم  چمن زادیم و از یک شاخساریم
تمیز رنگ و بو بر ما حرام است  کہ ما پروردۂ یک نو بہاریم

یہ کتبہ افغان گورنمنٹ کا ہدیہ ہے۔ مزار کے اندر چھت کے قریب دیواروں پر حضرت علامہ کے چیدہ چیدہ فارسی اشعار لکھے ہیں۔ اردو کا ایک شعر بھی نہیں ہے۔

گیسوئے اردو ابھی منت پذیر شانہ ہے
شمع یہ سودائی دل سوزی پروانہ ہے

میں بڑی حسرت کے ساتھ کتبے پر فارسی کے اشعار پڑھتا رہا۔ پھر خاموش، چپ چاپ سرہانے کھڑا ہو گیا۔ دل میں ایک طوفان امنڈ رہا تھا۔ ایک تلاطم بپا تھا، جسے میں تحریر میں نہیں لا سکتا۔ میں نے کیمرہ درست کیا۔ ایک ۔۔۔۔۔ دو ۔۔۔۔۔ تین ۔۔۔ چار فوٹو اندر اور باہر سے لے ڈالے۔

ہم قلعے کے چھوٹے دروازے پر پہنچے۔ سامنے مہاراجہ رنجیت سنگھ کے گردوارے کا سنہری کلس دھوپ میں جگمگا رہا تھا۔

ہم نے قلعے دار صاحب کا نام لے دیا اس لئے قلعے میں داخلے کا ٹکٹ بھی نہیں لیا اور بلا ٹکٹ ہی داخل ہو گئے ہم جس راستے سے قلعے کے اوپر چڑھ رہے تھے وہ ہاتھیوں کے لئے بنایا گیا تھا۔ سیڑھیاں بہت نیچی اور چوڑی تھیں قلعے دار صاحب بڑے بھائی کے دوست تھے ہم سے بڑے تپاک اور مسکراہٹ کے ساتھ ملے موصوف کو شعر و سخن سے بڑی دلچسپی ہے۔

Marfat.com

ہم نے بتایا کہ ہم قلعہ دیکھنے آئے ہیں اس لئے انہوں نے ہم سے کہا "آپ فوراً قلعہ دیکھ آئیے ورنہ پھر بند ہو جائے گا کیونکہ بند ہونے کا وقت ہو چکا ہے" ہم سیدھے قلعے کے میوزیم پہنچے یہاں پرانے ہتھیار۔ بندوق پستول وغیرہ رکھے تھے اور پنجاب کی مشہور جنگوں کے فوٹو بھی لگے تھے۔ میوزیم کوئی خاص نہیں تھا۔

دیوان عام اور دیوان خاص دیکھا۔ مسجد بند ہو گئی تھی۔ چوکیدار سے دوبارہ کھلوا کر دیکھی۔ بڑی خوبصورت سنگ مرمر کی چھوٹی سی مسجد تھی باہر سے مسجد کا گمان ہی نہیں ہوتا تھا۔ کیونکہ بھدی۔ بدشکل کالی کالی دیواروں میں گھری ہوئی تھی۔ ہم شیش محل، نہ دیکھ سکے کیونکہ چوکیدار بند کر کے چلا گیا تھا۔ ہم پھر پھرا کر قلعے دار صاحب کے پاس آ گئے اور بڑی دیر تک گپیں ہانکتے رہے۔

قلعے سے نکل کر ہم شاہی مسجد پہنچے۔ صدر دروازے کے اوپر کچھ "تبرکات" رکھے تھے اور ایک چھوٹا سا مذہبی میوزیم تھا۔ یہاں حضورؐ کے دندان مبارک تھے۔ حضرت علی کی دستار تھی۔۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بال ۔۔۔۔۔ حضرت غوث اعظمؒ کا کرتا۔۔۔۔۔ ہم نیچے اترے اور پانی سے بھیگی ہوئی کپڑے کی پٹی پر ہوتے ہوئے مسجد کی خاص عمارت میں پہنچے۔ مسجد کا صحن لق و دق میدان معلوم ہوتا تھا۔ پتھر کا فرش دھوپ سے تپ رہا تھا۔

خاص عمارت کی مرمت تقریباً ختم ہو چکی تھی۔ میں نے تیرا برس

Marfat.com

پہلے اس حالت میں نہیں دیکھی تھی۔ اب تو نہایت حسین معلوم ہوتی تھی۔ سنگ مرمر کے گنبد اور میناروں کی چھتریاں دھوپ میں چمکتی ہوئیں اور بھی حسین لگتی تھیں۔

ممو بھیا اور بھائی، تو نیچے رہے میں دو آنے کا ٹکٹ لے کر مینار پر چڑھ گیا۔ یہاں سے میں دور دور تک دیکھ رہا تھا۔ راوی بل کھاتا ہوا دور تک دھوپ میں چمک رہا تھا۔ دھوپ میں چمکتے ہوئے شاہدرے کے مینار۔ دھواں اڑاتا ہوا دیا سلائی کا کارخانہ۔ قریب میں منٹو پارک اور قلعہ۔ شہر میں یونیورسٹی ہال۔ گورنمنٹ کالج۔ کپڑے کی مل۔ دور پس منظر میں دھندلا دھندلا غبار۔

میری سب پونجی ختم ہو چکی تھی۔ میں پچاس روپوں کے منی آرڈر کے انتظار میں تھا مگر منی آرڈر آج آتا تھا نہ کل۔ حالاں کہ پشاور سے دو خط کراچی لکھ چکا تھا۔ کہ میرے وہ روپے جو میں رکھ آیا ہوں۔ فوراً لاہور روانہ کر دیجئے اور لاہور پہنچ کر بھی دو خط لکھ چکا تھا مگر جواب ندارد۔ میں تنگ آ گیا اور اس پریشانی میں نے بنا دٹی بیماری کا ایکسپریس (EXPRESS) تار دے ڈالا۔ مگر پھر بھی جواب ندارد۔ اب تو مجھے تاؤ آ گیا۔ میں نے بھابی کو کس کے، ایک خط لکھ ڈالا جس کا تیسرے دن ہی جواب آیا کہ آپ کا منی آرڈر پشاور کا خط ملتے ہی روانہ کیا جا چکا ہے۔ مگر منی آرڈر کو نہ آنا تھا نہ آیا

ہم لاہور کے تقریباً سب اہم اور تاریخی مقامات دیکھ چکے تھے

Marfat.com

اس لئے ہم نے روانگی کی ٹھانی مگر ہمیں ایک ہفتے کے لئے اور روک لیا گیا۔ میرا روز کا معمول تھا۔ صبح سب سے پہلے اخبار والے کی آواز پر اٹھنا۔ اخبار پڑھنا۔ ضروریات سے فارغ ہو کر ناشتے کے بعد دھوپ اور گرمی میں شہر کی گلیوں اور سڑکوں پر آوارہ گردوں کیطرح گھومتا پھرنا دوپہر کا کھانا کھا کر آرام کرنا۔ پھر شام کو تہا کر چاکو میاں کے ساتھ نکل جانا۔ انارکلی ۔ مال روڈ ۔ لارنس گارڈن ۔ ۔ ۔

آج میں اپنا پرانا مکان دیکھنے گیا جس میں تیرا برس پہلے آ کر مقیم ہوا تھا۔ مال روڈ پر کمرشل بلڈنگ کے پیچھے ایک تنگ گلی میں یہ مکان تھا۔ مکان میں قدامت کے آثار آ چلے تھے۔ اب معلوم نہیں کون رہتا تھا ساری روشنی پر چکیں پڑی تھیں۔ آج تیرا سال کی بیتی ہوئی باتیں میرے ذہن میں آ رہی تھیں۔

قدآور۔ بڑی بڑی مونچھوں والے چاند خاں سامنے والے مکان میں رہتے تھے۔ چاندخاں۔ چاندخاں کی چاندسی بیٹی۔ گلی میں ٹاٹ کے پردوں میں ایک نردد خاندان۔ دن بھر اس خاندان کی عورتیں آپس میں لڑتی رہتی تھیں۔ ہمارے مکان سے ملے ہوئے مکان میں ایک پٹھان خاندان رہتا تھا۔ اُن میں کا ایک لڑکا بڑا پتنگ باز تھا۔ بسنت، پتنگوں کا تہوار آیا۔ میں نے اس کی اڑتی ہوئی پتنگ توڑلی۔ میرا باہر نکلنا مشکل ہو گیا آخر ایک مرتبہ میں اس کے ہتھے چڑھ گیا۔ اس نے میری ٹوپی چھین لی پتنگ دے کر ٹوپی واپس ملی۔

Marfat.com

گلی کے نکڑ پر گلو پان والے کی دوکان تھی ۔ گلو! تم بڑے سیدھے۔ بڑے نیک تھے جیسے گائے ۔ تمہاری چندھیائی ہوئی چھوٹی چھوٹی آنکھیں۔ تمہارے کتھے چونے کے داغوں سے گل رنگ کپڑے ۔ تم اتنے سیدھے تھے کہ ہمارے یہاں کے نوکر کو ادھار پان دے دیتے تھے اور وہ پان کھا کر منہ رچا کر تمہاری دوکان کے آئینے میں اپنا چہرہ دیکھا کرتا تھا اور پھر جب 'دیوداس' فلم دیکھ کر آتا تو گھنٹوں بیٹھ کر رو دیا کرتا تھا۔ تم نے اُسے خوب پان کھلائے ۔سگریٹیں پلائیں ۔ مگر ایک دن وہ بغیر تمہارا قرض چکائے بھاگ گیا۔ تمہاری نیکی ۔ تمہارا گائے پن ۔۔۔۔۔۔

گلو! اگر تمہاری دوکان ہوتی تو میں ضرور پان کھاتا اور سگریٹ بھی پیتا۔ حالاں کہ نہیں پان کھاتا ہوں اور نہ سگریٹ پیتا ہوں مگر صرف تمہاری خاطر۔۔۔۔ مجھے تمہاری نیکی اور سیدھے پن سے اُنسیت تھی ۔ مگر آج نہ تم ہو۔ نہ تمہاری دوکان ؛۔۔۔۔۔

معلوم نہیں تم ہندوستان میں کسی فٹ پاتھ پر دوکان لگاتے ہو یا شمشان میں ۔؟!

بس گلی سے نکل کر شاہ علمی گیٹ کے سامنے ایک رات والی، مسجد دیکھنے چلا گیا۔

مسجد تو بنا دی شب بھر میں ایماں کی حرارت والوں نے
من اپنا پرانا پاپی تھا، برسوں میں نمازی بن نہ سکا

Marfat.com

اسی مسجد کے لئے اقبال کا یہ شعر ہے مسجد دوبارہ تعمیر ہوئی ہے اور کافی خوبصورت بنائی ہے سامنے شاہ علمی گیٹ اور محلہ ہے۔ معلوم ہوتا تھا کہ میں دوبارہ موہنجو دارو یا ٹکسیلا کی سیر کر رہا ہوں۔ ملبے کو صاف کر کے ایک چوڑی سڑک نکالی گئی تھی جو زیر تعمیر تھی۔

انارکلی میں ایبک روڈ پر سلطان قطب الدین ایبک کی قبر دیکھی ایک بند گلی میں ہندوستان کا پہلا مسلمان تاجدار چین کی میٹھی نیند سو رہا تھا۔

آج چاندنی کھلی تھی۔ میں اور چاکو میاں چاندنی کا لطف اٹھانے گھر سے نکل گئے۔ گول باغ پہنچے۔ ترکوں کی توپ پر ایک 'جوڑا' محو گفتگو تھا۔ ہم نے مخل ہونا مناسب نہیں سمجھا پھرتے ہوئے یونیورسٹی گراونڈ پہنچے۔ جنگلے کو پھاند گئے۔ قریب ہی موسمیات کی تجربہ گاہ تھی ( OBSERVATORY ) تھی بہت بڑا گراؤنڈ تھا اور سارے گراؤنڈ میں گھاس لگی تھی۔ ہم گھاس پر لیٹ گئے۔ بڑی رات تک گپیں ہانکتے رہے اور چاندنی کا لطف اٹھاتے رہے۔

اتوار کے دن کامران کی بارہ دری جانے کا پروگرام بن چکا تھا۔ ہمیں نور جہاں کا مزار بھی دیکھنا تھا۔ اس لئے ہم بس سے شاہدرہ اتر گئے اور پشاور جانے والی ریل کی لائین پر چلنے لگے۔ تھوڑی دور پر کھجوروں کے جھنڈ میں ایک شکستہ سی بارہ دری دکھائی دیتی تھی۔ یہی نور جہاں سابق ملکۂ ہندوستان کا مزار تھا۔

Marfat.com

ادب اے دل! ادب کر روضۂ نور جہاں ہے یہ
مقدس خواب گاہِ ملکۂ ہندوستاں ہے یہ

مگر یہاں تو بجائے ادب کے ڈھول پیٹا جا رہا تھا۔ ڈھول پیٹ پیٹ کر قوالی ہو رہی تھی۔ چند دہلی والے حضرت نظام الدین اولیاؒ کے مزار کی سنّت تازہ کر رہے تھے۔

درمیان میں دو قبریں بنی تھیں۔ ایک نور جہاں کی دوسری اس کی بیٹی کی جو شیر افگن سے تھی۔ یہ تمیز کرنا مشکل تھا۔ کہ کون سی قبر نور جہاں کی ہے۔ اور کون سی اس کی بیٹی کی۔ اب تو مقبرے کی کافی مرمت کر دی گئی تھی اور باہر چاروں طرف گھاس لگا کر پارک سا بنا دیا تھا لوگ یہاں پک نِک بھی کر سکتے تھے۔ مگر گزشتہ مرتبہ جب میں نے اسے دیکھا تھا تو یہ حالت نہ تھی ۔ ۔ ۔ ۔ چمگادڑوں نے گھونسلے بنا رکھے تھے۔ انتہائی شکستہ ایک کھنڈر سا معلوم ہوتی تھی۔

ہم یہاں سے دو میل پیدل چل کر راوی کے کنارے سرسبز اور گھنے درختوں کے درمیاں ایک بارہ دری میں پہنچے یہ کامران کی بارہ دری تھی۔ لاہور میں پک نک کرنے کے لئے اس سے بہتر جگہ کوئی نہیں ہے بارہ دری کی آدھی عمارت دریا میں گر کر دھنس گئی ہے اور آدھی باہر ہے یہاں دریا بارہ دری سے 'سیدھا' ٹکراتا ہے۔ دریا کے دونوں کنارے بڑے سرسبز اور شاداب ہیں۔

اتوار کا دن تھا اس لئے بہت سے لوگ پک نِک پر آئے

Marfat.com

ہوئے تھے۔ ایک طرف کچھ پہلوان ورزش کر رہے تھے جب وہ لوگ ایک چھوٹے سے بوٹ بوٹ میں بیٹھ کر دوسرے کنارے جانے لگے تو چند کالج کے لڑکوں نے جو پک نک پر آئے ہوئے تھے اور چائے بنا رہے تھے پہلوانوں سے پوچھا "استاد کسرت کس طرح کرنا چاہیئے؟"

"ڈنڈ اور بیٹھک تھوڑی تھوڑی کر کے جتنی لگا سکتے ہو لگاؤ"

دوسرے نے پوچھا "استاد! صحت کس طرح قائم رکھی جائے؟"

استاد نے چائے کی کیتلی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "چائے پینا چھوڑ دو۔ بڑی مضر ہے"۔ اور بوٹ میں بیٹھ کر چل دیئے۔

کالج کے لڑکے چائے پیتے جاتے تھے اور پہلوانوں کا مذاق اُڑاتے جاتے تھے "واہ۔ ! خوب رہی چائے مت پیو۔ ؟ ؟ !"

اور استاد بیچ دریا میں پہنچ چکے تھے۔

ہم کود کر خوب نہائے قریب ہی ایک چھوٹا سا جزیرہ تھا میں اور چاکو میاں تیر کر اس پر گئے۔ ہم جزیرے کے قریب پہنچے بھی نہ تھے کہ دلدل میں دھنسنے لگے۔ جدھر جاتے اُدھر ہی دلدل۔ میں ہندوستان کے بڑے بڑے دریاؤں گنگا جمنا، ہم تپتر، سندھ، گومتی چنبل وغیرہ میں نہایا ہوں مگر ایسا دلدل میں نے کسی دریا میں نہیں پایا۔ جب ہم گھٹنوں گھٹنوں دھنسنے لگے تو واپس بھاگے اور تیر کر پھر کنارے آ گئے۔

یہاں سے ہماری دو پارٹیاں ہو گئیں ایک پارٹی مع ممو بھیا کشتی کے ذریعے دوسرے کنارے پہنچ کر شہر چلی گئی۔ میں چاکو میاں اور

Marfat.com

چاکو میاں کے بڑے بھائی گاماں پہلوان سے ملنے گئے۔

رستم زماں گاماں پہلوان ـــ کامران کی بارہ دری سے آدھ میل کے فاصلے پر اپنے باغ میں رہتے تھے۔ ہم ایک شکستہ سی سڑک پر چلتے ہوئے گاماں کے باغ پہنچے۔ دھوپ پیلی پڑ چکی تھی۔ اور ایک برگد کے درخت کے نیچے رستم زماں گاماں پہلوان ایک گرد آلود ٹوٹی پھوٹی چٹائی پر بیٹھے تھے۔ پاس تیتر کا پنجرہ رکھا تھا۔ وجیہ اور شاندار چہرہ بڑی بڑی مونچھیں۔ بڑی سی توند۔ ایک دیہاتی سے جو سامنے کی دوسری گرد آلود چٹائی پر بیٹھا تھا۔ باتیں کر رہے تھے۔

ہم نے جاتے ہی سلام کیا۔ اٹھ کر بڑے تپاک سے ملے۔ ہم بلا تامل اسی گرد آلود چٹائی پر بیٹھ گئے۔ جس پر دیہاتی بیٹھا تھا۔

چاکو میاں نے لفاظی شروع کر دی "آپ کی ذات گرامی پر ہم فخر کرتے ہیں۔ آپ نے غیر منقسم ہند کا نام دنیا میں سربلند کیا ـــ اب پاکستان کو آپ پر ناز ہے (میری طرف اشارہ کر کے) یہ صاحب کراچی سے آپ سے ملنے آئے ہیں۔

"یہ سب خدا کا فضل و کرم ہے اور آپ لوگوں کی دعا ہے۔ ورنہ میں کیا ہوں ـــ میری کیا ہستی ہے۔؟" اتنی عاجزی اتنی انکساری اتنی سادگی میں دنگ تھا۔ رستم زماں ہمارے سامنے گرد آلود چٹائی پر بیٹھا چلم کے کش لے رہا تھا اور ہم لوگ متحیر نگاہوں سے اسے تک رہے تھے۔ بدن ڈھل چکا تھا۔ بازوؤں کا گوشت لٹک گیا تھا

Marfat.com

توند بھی زیادہ پھول گئی تھی مگر چہرے کا رعب و داب اسی آب و تاب سے باقی تھا۔

چاکو میاں نے پوچھا "آپ نے زبیسکو کو کس طرح چت کیا تھا ؟"

"پلک جھپکاتے ہیں، یعنی جس نے پلک جھپکائی وہ تو کشتی نہ دیکھ سکا اور زبیسکو چت تھا۔"

"واہ ! ۔ خوب"!!

ہم لوگ اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے رہے میں نے کہا اگر آپ پسند کریں تو میں آپ کا ایک فوٹو لے لوں؟ اپنے بازوؤں کی طرف نگاہ ڈالتے ہوئے کہنے لگے "اب میں کیا رہ گیا ہوں ۔؟ کیا کیجئے گا فوٹو لے کے؟"

میں نے یقین دلایا کہ میں پریس رپورٹر نہیں ہوں اور نہ تصویر کسی اخبار یا رسالے میں چھپواؤں گا۔ تو مونچھوں پر تاؤ دے کر تیار ہو گئے میں نے فوٹو لے کر شکریہ ادا کیا۔ ہم لوگ تھوڑی دیر اور بیٹھ کر چلے آئے۔

ہمیں ایف۔ سی (F.C) کالج دیکھنا تھا جو اب میاں میر کی نہر کے کنارے نیا بنایا گیا ہے۔ اس کے علاوہ میاں میر کا مزار بھی دیکھنا تھا۔ میں اور موبھیا میاں میر جانے والی بس میں بیٹھ گئے یہ بس بجائے میاں میر کے مزار جانے کے میاں میر ریلوے اسٹیشن جاتی تھی ہم ریلوے اسٹیشن پر میاں میر کا مزار پوچھنے لگے۔ معلوم ہوا مزار یہاں سے دو میل ہوگا۔ ہم غلط نمبر کی بس میں آگئے ہیں۔ ہمیں اپنی اس دلچسپ غلطی پر غصہ

Marfat.com

بھی آیا اور ہنسی بھی۔ بہر حال مزار جانے کا ارادہ ترک کر دیا اور ایف سی کالج جانے کی ٹھانی۔ کالج نہر کے پل سے ایک میل کے فاصلے پر نہر ہی کے کنارے تھا۔ ہم نہر پار کر کے آئے تھے اور نہر کا پل یہاں سے دو میل تھا۔ ہم پھر اُسی بس میں بیٹھ گئے اور نہر کے پل پر اُتر گئے۔ نہر کے کنارے ایک میل پیدل چل کر کالج کی عمارتیں نظر آئیں۔ ہماری بدقسمتی تھی۔ تعطیلات کی وجہ سے کالج بند تھا۔ ہوسٹلوں میں وہ طلبا اور طالبات جو گھر نہ جا سکے تھے کھیل کود رہے تھے۔ گپیں ہانک رہے تھے۔ کچھ پڑھ رہے تھے۔ کلاس روم لیبورٹیریز وغیرہ بند تھیں۔ ہمیں بڑی مایوسی ہوئی۔ دھوپ اور گرمی میں پیاس ستا رہی تھی۔ ایک جگہ نل کا پانی پیا اور تھوڑا دم لیا۔ ہمیں معلوم ہوا تھا کہ پنجولی آرٹ پکچرز کا اسٹیڈیو بھی۔ ایف۔ سی۔ کالج کے قریب ہی ہے لہٰذا پوچھتے ہوئے وہاں پہنچے، دھوپ میں نہر کے کنارے ایک میل اور چلنا پڑا۔ نہر کا دوسرا پل عبور کر کے ہم اسٹیڈیو کے دروازے پر پہنچے۔ جیسا پڑھتے اور سُنتے آئے تھے ایک 'خان' سے سابقہ پڑا خان نے کہہ دیا "مال روڈ پر دفتر سے اجازت لائیے گا تو جانے دے گا۔ ورنہ نہیں۔"

میں نے کہا "خان ہم ایکٹر نہیں ہیں۔ ملازمت بھی نہیں کرنا چاہتے صرف اسٹیڈیو دیکھنا چاہتے ہیں" مگر خان، نہیں مانا۔ ہمیں بڑی کوفت ہوئی ہمارا آج کا سارا دن بیکار گیا۔

ہم کربلا میں مولانا محمد حسین آزاد کی قبر دیکھنے گئے پہلے تو ہم ایک

Marfat.com

تہہ خانے میں گئے یہاں ایک تعزیہ رکھا تھا۔ تعزیے کے قریب ہی فرش پر ایک نوجوان بیٹھا ہوا بڑے پُراثر اور درد انگیز راگ میں مرثیہ پڑھ رہا تھا۔ اور ایک بڑی بی کالا بُرقع پہنے تعزیہ پکڑے زار و قطار رو رہی تھی۔ تہہ خانے سے نکل کر ہم آزاد کی قبر پر گئے۔ ان کی قبر پر ایک چھتری بنی تھی۔ قبر بھی سادی سی تھی۔ چھتری کے اندر قبر کا سہارا لیے ایک کشمیری لڑکی کالے، میلے کچیلے اور تار تار کپڑوں میں ـــــ اپنے لختِ جگر کو دودھ پلا رہی تھی۔ بچہ چھاتیوں سے چمٹا ہوا مزے لے لے کر دودھ پی رہا تھا۔ اُسے کیا خبر تھی کہ مادرِ ـــ اور مادرِ وطن پر کیا بیت رہی ہے۔ ہمیں دیکھا تو وہاں سے اٹھ کر دوسری طرف چلی گئی اور زمین پر بیٹھ کر بچے کو پھر دودھ پلانے لگی۔

مجھے خرچ کی بڑی تکلیف تھی اور منی آرڈر ابھی تک نہیں آیا تھا۔ ہماری روانگی کی تاریخ بھی قریب آگئی تھی۔ ہمیں پہلی تاریخ کو لاہور چھوڑ دینا چاہیئے تھا۔ آخر تنگ آکر میں نے منی آرڈر کی امید چھوڑ دی اور چاکو میاں سے عہد نامہ کر لیا کہ وہ تنخواہ ملتے ہی قرض دے دیں گے خرچ نہ ہونے کی وجہ سے ہم سینما بھی نہ دیکھ سکے تھے۔

مگر آج میں اور چاکو میاں سینما چلے گئے۔ لاہور کی میکلوڈ روڈ اگر میکلوڈ روڈ کے بجائے "سنمستان" یا "نگارستان" روڈ کہی جائے تو زیادہ موزوں رہے گا۔ ایک ہی سڑک پر قریب ہی قریب کئی سینما ہیں میری یاد مجھے تیرہ برس پیچھے لے گئی۔ اس زمانے میں سینما

Marfat.com

دیکھنا جیسے سنگین جرم تھا اور اس جرم کا مرتکب قابل گردن زدنی سمجھا جاتا تھا۔ مگر آج میرے لئے سینما دیکھنا جرم نہ تھا۔ اپنے سابقہ زمانے کی تلخیاں سینماؤں پر حسین اور رنگین بورڈ دیکھ کر بھلا رہا تھا۔ کھیل شروع ہونے میں کچھ دیر تھی اس لیے ہم دونوں ایک ٹھیلے والے سے سڑک کے کنارے کھڑے ہو کر شربت پینے لگے ٹھیلے والا جلدی کرنے لگا میں نے پوچھا " آخر کیا بات ہے کیوں جلدی کر رہے ہو "؟

ایک لال پگڑی کیطرف اشارہ کر کے " وہ چلا ئے گا صاحب! آج کل یہ خدا بنے پھرتے ہیں۔ ہمارا ہی جی جانتا ہے "۔

" کچھ نہیں ۔۔! ہم یہیں کھڑے شربت پئیں گے۔ دیکھا جائے گا "؟ اور مزے لے لے کر شربت پیتے رہے فلم اچھا تھا خوب لطف آیا۔

آج لاہور میں ہماری آخری شب تھی۔ دوسرے دن شام کو ہم روانہ ہو رہے تھے ۔ میں اور چاکو میاں آخری بار لارنس گارڈن گئے۔ گلستان " رسٹورنٹ " میں رباب بج رہا تھا۔ اور گھنگھروؤں کی جھنکار چھا چھم گونج رہی تھی۔ ہم دونوں گرم گرم چائے پی رہے تھے اور اس رباب۔ اور چھا چھم کی جھنکار سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔

چاکو میاں نے غم دوراں کی باتیں چھیڑ دیں " چینی میاں ۔۔۔ "؟ وہ مجھے چینی میاں کہتے ہیں " ہم لوگوں کی بھی یہ کوئی زندگی ہے؟ ۔ صبح سے شام تک آفسوں میں بیل کیطرح جتے رہے۔ شام کو گھر آ گئے

Marfat.com

رات کو سو گئے۔ زندگی ہے کہ کولہو کے بیل کیطرح ایک ہی نہج پر چل رہی ہے۔ پھر پیسے بھی کچھ زیادہ نہیں ملتے۔ ابھی تو بیوی بچے بھی نہیں ہیں اس پر یہ حال ہے"

میں نے ایک لمبی اور ٹھنڈی سانس بھری "ہاں۔ چاکو! اب تو زندگی صرف اتنی ہی رہ گئی ہے۔ کیا کیا جائے؟ — مگر یہ تم کیا لے بیٹھے؟ — یہ نغمہ۔ یہ رباب۔ یہ گھنگھروؤں کی جھنکار۔ یہ گرم گرم چائے۔ پیو۔ پیو! خوب پیو۔ تاکہ اس چائے کے گرم گرم گھونٹوں میں ہماری آخری ملاقات غیر فانی ہو جائے اور ہم تلخیٔ دوران بھلا دیں۔۔۔۔؟

ہم دونوں بہت دیر تک بیتی ہوئی باتیں یاد کرتے رہے پھر گھر آ گئے۔

صبح چاکو میاں کو تنخواہ ملنے والی تھی۔ وہ آفس چلے گئے۔ بعد میں میں بھی اُن کے آفس پہنچا۔ آفس کیا تھا۔ ردّی خانہ تھا۔ چاکو میاں رسیدوں کے انبار میں بیٹھے ہوئے تھے انہوں نے امید بندھائی کہ ایک بجے کھانے کے وقت ضرور تنخواہ لے کر آؤں گا۔

چاکو میاں جب کھانا کھانے آئے تو میں نے روپیوں کا مطالبہ کیا۔ بڑا منہ سکھا کر جواب دیا "چلتی میاں۔ ؟! تنخواہ تو ملی ہی نہیں" اس انداز سے کہا کہ مجھے کچھ یقین سا ہو گیا۔ پھر خود ہی کہنے لگے "اچھا — تم بھی کیا یاد کرو گے۔ کسی رئیس سے پالا پڑا تھا" اور جیب سے نوٹ نکالنے لگے۔ میں اچھل پڑا۔

عصر کو جیب چاکو میاں آئے تو سامان وغیرہ درست کرنے کے

Marfat.com

بعد ہم دونوں انار کلی گئے۔ ریل کے ٹکٹ خریدے اور اپنے ایک دوست کے لئے ایک بانسری خریدی۔ ہم دونوں ایک کتابوں کی دوکان پر ریلوے ٹائم ٹیبل خرید رہے تھے اسی دوکان پر ایک دبلے پتلے سے صاحب عینک لگائے بیٹھے تھے۔ چاکو میاں نے میرے چٹکی بھری "یہ منٹو ہیں" سعادت حسن منٹو۔ منٹو! نہ ترقی پسند ہے نہ فرسودگی پسند، وہ بو' ہتک '، ' ٹھنڈا گوشت ' لکھتا ہے۔ لطف یہ ہے کہ منٹو کے جن افسانوں پر بد اخلاقی کا الزام لگایا جاتا ہے اُنھیں کو سب چھپ چھپ کر اور چٹخارے لے لے کر پڑھتے ہیں۔

ہم گھر آئے۔ کھانا کھایا اور مل ملا کر تانگے میں اسٹیشن روانہ ہو گئے۔ ایکسپریس ٹھیک وقت پر آیا۔ ہم نے اپنا سامان تھرڈ کلاس میں سب سے پیچھے کے ڈبے میں رکھا۔ آگے سے آنے والوں نے ڈبے کی ہر سیٹ پر قبضہ جما رکھا تھا۔ سب نے اپنے بستر کھول کر ایک ایک سیٹ پر جما دیئے تھے۔ میں نے کوشش کی کہ ایک ہی سیٹ پر کسی طرح قبضہ کر لوں مگر ناکام رہا ایک جلے دل مہاجر جگہ نہ ملنے کی وجہ سے اپنے بکس پر بیٹھے تھے۔ کہتے لگے "یہ پنجاب ہے۔ یہاں نہیں چلے گی"۔۔۔ !! "مگر اس میں پنجابی۔ نان پنجابی کا کون سا سوال ہے؟" میں نے جھنجلاہٹ میں کہا۔

ہمارے ڈبے کے پیچھے ایک سیلون کار لگی۔ ایک لمبا تڑنگا انگریز آیا اور اس میں داخل ہو گیا۔ معلوم ہوا ریلوے کا جنرل منیجر ہے اور

Marfat.com

کوئٹہ جا رہا ہے۔ اس کی وجہ سے اسٹیشن کے بڑے بڑے افسر بھاگ دوڑ کر رہے تھے۔

گارڈ نے سیٹی دی۔ ہم نے چچا کو میاں، بھائی، اور دوسروں سے ہاتھ ملائے۔ اور گاڑی چل دی۔

ہم لاہور چھوڑ رہے تھے لاہور کی روشنیاں دور تک جگمگا رہی تھیں۔ لاہور۔ لاہور میں میں نے یہ دن بڑی دلچسپی سے گذارے تھے۔ لاہور میں کتنا اطمینان تھا کتنا چین اور سکون تھا۔ مگر یہ گاڑی اب پھر مجھے اسی ہنگامی زندگی کے دلدل میں کھینچے لئے جا رہی تھی جس سے میں نکل کر بھاگا تھا۔

مو بھا تو جگہ بنا کر بیٹھ گئے۔ بکس اور بکس پر بستر رکھا ہوا تھا میں بستر پر لیٹ گیا۔ میرا سر ایک طرف جھکا ہوا تھا اور ٹانگیں دوسری طرف زمین سے ٹکی ہوئی تھیں۔ بھلا ایسی حالت میں نیند کہاں ـــ؟!
وقت گذاری کے لئے میں نے تھیلے سے کتابوں کی فہرستیں نکالیں ان میں بھی جی نہ لگا تو "سویرا" کا کانفرنس نمبر نکال لیا اور ورق گرداتی کرتا رہا۔ مگر سویرا ابھی بہت دور تھا۔ اور منزل کا کوئی پتہ نہیں تھا میں اونگھنے لگا مگر دھول کی زیادتی کی وجہ سے گھبرا کر اٹھ بیٹھا حلق ناک۔ کان اور آنکھوں میں دھول گھسی جاتی تھی۔ دم گھٹ رہا تھا کپڑے دھول سے اٹ گئے تھے۔ اور بار بار جھاڑنا پڑ رہے تھے۔ ہر شخص پریشان تھا۔ شاید ہم صحرائے اعظم افریقہ میں جا رہے تھے

Marfat.com

اندھیری رات میں کچھ دکھائی نہ دیتا تھا ایک بجے رات میں منٹگمری آیا
ہم نیند میں بے چین ــــ اونگھتے۔ دھول پھانکتے رہے
اور گاڑی منزل کی جانب بھاگتی رہی۔ ہم نے ملتان چھوڑ دیا تھا اور
خانیوال سے لودھراں مختصر راستے سے جا رہے تھے۔ تاریکی کم ہو چلی تھی
تارے جھلملا رہے تھے اور پو پھٹنے والی تھی۔ میرے ذہن کی سطح
پر جوش کا ایک شعر ابھر رہا تھا۔

لیلائے آب و رنگ کا ڈیرا قریب ہے
تارے لرز رہے ہیں سویرا قریب ہے

گاڑی بہاولپور کے پلیٹ فارم پر کھڑی ہو چکی تھی۔ اور جب
گاڑی یہاں سے چلی تو سورج پورا نکل آیا تھا۔ خانپور پر ہم نے ناشتہ
کیا۔ ایک بیچے ریہڑی پر مچھلی اور مرچوں بھرے کباب کھائے۔
ہم دریائے سندھ کے مشرقی کنارے پر جا رہے تھے جگہ جگہ
بڑی بڑی نہریں لائین کے نیچے سے گذر جاتی تھیں۔ کیھوڑینا کے جنگل
صاف کر کے کھیت بنائے گئے تھے اور ہر طرف دھان کے کھیت
لہلہا رہے تھے۔ دھوپ اور گرمی کی شدت تھی۔ ڈھائی بجے دن کو
ہم ٹنڈو آدم پہنچے۔ دوسری لائین پر میل، آکر کھڑا ہو گیا۔ سفید
رنگ کی ایئر کنڈیشنڈ کوچ ہمارے ڈبے کے سامنے کھڑی
ہو گئی اور نیچے کے ڈھکنے کھول کھول کر برف کی سلیں رکھی جانے
لگیں۔

Marfat.com

موہیا مجھ سے کہہ رہے تھے "کہیں سے برف مل جائے تو بڑا اچھا ہو" اور میں پیاس کی شدت سے دھوپ اور گرمی میں پلیٹ فارم پر پانی کی تلاش میں چکر لگا رہا تھا۔ بمشکل تمام ایک پانی پلانے والا ملا۔ مگر ایک انار سو بیمار، پانی پی کر جان میں جان آئی۔

Marfat.com

# حیدرآباد سندھ

پانچ بجے ہم حیدرآباد سندھ پہنچے۔ ہمیں یہاں چوبیس گھنٹے اپنے ایک چچازاد بھائی کے یہاں ٹھہرنا تھا۔ دور سے حیدرآباد نظر آرہا تھا۔ حیدرآباد کے دلچسپ "بادکش" منہ پھاڑے ہوئے ہوا پھانک رہے تھے یہ بادکش بڑے دلچسپ معلوم ہوتے ہیں اور سندھ میں عام طور پر مکانوں میں ہوا کے لئے بنائے جاتے ہیں۔

ہمارا تانگہ قلعے کی دیوار کے نیچے جارہا تھا۔ جس سڑک پر ہم جارہے تھے وہ نہایت شکستہ حالت میں پڑی تھی۔ سڑک میں جگہ جگہ گڑھے پڑے ہوئے تھے۔ آخر دھکے کھاتے کھاتے جب میں تنگ آگیا تو میں نے تانگے والے سے پوچھا "یہاں کی میونسپلٹی کیا کرتی رہتی ہے۔؟ آخر کس مرض کی دوا ہے؟؟

تانگے والے نے بڑے اطمینان سے جواب دیا "سوئی رہتی ہے کرے گی کیا۔؟"

ہم گل شاہ روڈ پر اپنے بھائی کے مکان پہنچے۔ شاید حیدرآباد میں سب سے زیادہ گندی اور غلیظ جگہ گل شاہ روڈ ہے۔ ہر طرف کوڑے کرکٹ کے انبار لگے تھے۔ گندے پانی کی ساری نالیاں ایک بڑے سے گندے نالے میں گرتی تھیں اور اس گندے نالے کا کہیں نکاس نہیں تھا یہ گندا اور غلیظ پانی بہت بری طرح سڑتا تھا پھر اس علاقے میں زیادہ

Marfat.com

ترمانگے والے بستے تھے۔ ہر طرف گھوڑوں کی لید۔ اور پیشاب سے
گھر کافی اچھا تھا مگر ماحول بڑا گندا تھا۔ مکانوں کی قلت ہونے کے سبب یہ مجبوری تھی۔ گھر میں ہمارا کافی جوش و خروش کے ساتھ استقبال ہوا۔ سفر کی تکان۔ دھول اور گرمی کی وجہ سے ہمارا برا حال تھا ___ الجھے۔ بکھرے اور دھول سے اٹے ہوئے بال ___ گرد آلود کپڑے ___ چہروں پر گرد کا پوڈر ___ ہماری ایک بہن صاحبہ فرمانے لگیں۔ "تم لوگ تو بڑے گورے چٹے ہو گئے ہو" ایک بھابی صاحبہ پہلے تو بڑے غور سے ہماری صورتوں کا معائنہ فرماتی رہیں پھر گردن کو جھٹکا دیا ہنس کر ___ "کالی کالی تو ہو نہیں ہو گئیں" اور یہ جادہ جا ___ پنجاب کی دھول، سندھ کی گرمی اور دھوپ۔ اور تھرڈ کلاس کے سفر نے ہماری یہ بے آبروئی کرائی۔

پانی کی کمی کیوجہ سے ہم آدھ میل کے فاصلے پر دریائے سندھ کی ایک طوفانی نہر میں خوب نہائے۔ کپڑے بدلے اور گھر آ گئے دروازے پر چھوٹے خان تھے۔

چھوٹے خان ___ دبلے پتلے۔ لمبے سے۔ ہر وقت پان کھاتے ہوئے بیڑی پیتے ہوئے۔ سیدھے۔ نیک۔ خلوص کے پتلے غریب مگر مہمان نواز ___ چھوٹے خان بیڑیاں بناتے تھے اور بیڑیاں بنانے میں استاد مانے جاتے تھے۔ حیدر آباد میں کوئی گلی۔ کوئی کوچہ ایسا نہ ہو گا جہاں چھوٹے خان کو لوگ نہ جانتے ہوں۔ چھوٹے خان چلائے

Marfat.com

کے بڑے شوقین تھے۔ گذشتہ مرتبہ جب میں حیدرآباد آیا تھا تو انھیں کے یہاں ٹھہرا تھا۔ چھوٹے خان اپنا کام ہرج کر کے دن بھر میرے ساتھ پھرتے تھے۔ جگہ جگہ چائے پلواتے زبردستی پان کھلواتے۔ مہمان نوازی میں کوئی کسر اُٹھا نہ رکھی تھی ہماری آمد کی اطلاع چھوٹے خان کو ہو گئی تھی کافی دیر تک چھوٹے خان سے باتیں ہوتی رہیں پھر ہم لوگ کھانا کھا کر سو گئے۔

کوڑی بیراج جانے کی امید ختم ہو گئی تھی۔ کیوں کہ جن صاحب کے ساتھ میں دیکھ کر آیا تھا وہ ملازمت چھوڑ چکے تھے۔ دوسری کوئی صورت نہ تھی۔ اس لئے کوڑی بیراج جانے کا ارادہ ملتوی کر دیا اور صبح ناشتہ کر کے اپنے ایک عزیز سے ملنے ہیرا باد چلے گئے۔

ہیرآباد یہاں کا سب سے اچھا محلہ ہے بڑے باقاعدہ اور باترتیب مکان بنے ہوئے ہیں۔ سڑکیں بھی کشادہ اور کھلی ہوئی ہیں۔

ہم شاہی بازار کی طرف سے واپس ہوئے۔ شاہی بازار کی ابتدا میں مارکیٹ ہے اور ایک خوبصورت دروازہ ہے بازار کافی لمبا اور تنگ ہے۔ لمبائی میں قلعے تک چلا گیا ہے یہ بازار ایک نیچی اور لمبی پہاڑی پر بنا ہے۔ جس کے دونوں طرف ڈھال پر پرانا شہر آباد ہے پہاڑی کی سب سے اونچی چوٹی پر قلعہ بنا ہوا ہے۔ جتنی پتلی اور پُرپیچ گلیاں میں نے حیدرآباد میں دیکھیں کسی اور شہر میں نہیں دیکھیں۔ مجھے ان گلیوں کا جغرافیہ تین دن کی 'عملی رٹائی' کے بعد یاد ہوا تھا۔

Marfat.com

ہم سب گنگو بندر بندر سے سندھ کا پل دیکھنے چلے گئے۔ یہ پل پانچ چھ فٹ نیچے ہو کر دریا کے کنارے پر اتر گیا۔ سڑک کے دونوں طرف سایہ دار درخت لگے تھے۔ سڑک کے ایک طرف ریلوے لائن بھی سرکٹ ہاؤس اور ... گاہ تھا۔۔۔۔ ہم نزدیک کے ایک چھوٹے پارک کے پاس گاڑی سے اتر گئے۔ دریا کی طرف کو بھاگا اور شیشوں کا آمد و رفت بند تھی۔ اس لیے ہم کشتی کی سیر نہ کر سکے۔

ہم لوگ گولڈن ہوا کے پل پر چلے گئے۔ جس پر حیرت انگیز طور پر رکھ کر دیکھا جاتا ہے کہ جہاں ایک ہی پل ریل گاڑی اور تیز رفتار گاڑیوں کے چھوٹے ہر قسم کا سفر ہوتا ہے۔ پل کے درمیان میں ریل گاڑی چلتی ہے۔ دو طرف سڑکیں ہیں۔ دونوں سڑکیں تنگ ہیں۔ اگر سامنے سے موٹریں گذرے تو گاڑی سڑک پر کھڑی نہیں رہ سکتی۔ سے جنگلے سے چپک کر کھڑا ہونا پڑے گا ورنہ وہ بس یا موٹر کی لپیٹ میں آ جائے گا۔ اس مقصد سے کھمبوں پر کوئی جگہ بھی نہیں بنائی۔ ورنہ عام طور پر اگر یہ موقع ہو تو کھمبوں پر تھوڑی جگہ بنا دیتے ہیں۔ جہاں مسافر محفوظ رہ سکتا ہے۔ اس کے علاوہ جب سڑک پل سے نکلتی ہے تو ڈھلوان پر اتر چلی جاتی ہے اور تھوڑی دور جا کر زاویہ قائمہ RIGHT ANGLE بناتی ہوئی مڑتی ہے۔ یہ سڑک کی انتہائی خطرناک حالت ہے اس پر حادثہ ہو جانا یقینی ہے۔

ریل کی لائین درمیان میں صرف ایک ہے حالاں کہ اہمیت

Marfat.com

کو دیکھتے ہوئے دہری لائین ( DOUBLE LINE ) ہونا چاہیئے تھی جیسا کہ کراچی سے لودھراں تک ڈبل لائین ہے۔ چوڑی لائین BROAD GAUGE کے اندر چھوٹی لائین METER GAUGE بھی ڈالدی گئی ہے۔

ہم پل پر کھڑے ہوئے پانی کے بہاؤ کا تماشہ دیکھ رہے تھے۔ دوسرے کنارے کوٹری کا قصبہ دکھائی دے رہا تھا۔۔۔۔۔ اور دور تک پانی ہی پانی ــــ

ہمیں گدو بندر کا پاگل خانہ دیکھنا تھا۔ ہمیں دیر ہو چکی تھی۔ اور پاگل خانہ بند ہو گیا تھا۔ میں گذشتہ مرتبہ یہ پاگل خانہ دیکھ چکا تھا۔ دو آنے کے ٹکٹ میں انسان پاگلوں میں رہ کر خود بھی پاگل بن جاتا ہے لوگ کہتے ہیں قبرستانوں میں جا کر حسرت اور عبرت حاصل ہوتی ہے۔ میں کہتا تھا نہیں۔ ! یہ غلط ہے ؟ ! حسرت اور عبرت ہسپتالوں میں حاصل ہوتی ہے مگر پاگل خانہ دیکھ کر یہ معلوم ہوا کہ حسرت اور عبرت ہسپتالوں سے زیادہ پاگل خانوں میں برستی ہے۔

یہاں بقراط و سقراط، سکندر اور نپولین، نیوٹن اور آئن سٹائین مارکس اور لوتھر، شیکسپیر اور گوئٹے دھول میں لوٹتے اور خاک اڑاتے نظر آتے ہیں۔ جس طرح چڑیا گھر میں شیر اور دوسرے خونخوار جانور موٹی موٹی لوہے کی سلاخوں دار کوٹھریوں میں بند ہوتے ہیں اور ان میں موٹے موٹے مضبوط تالے پڑے ہوتے ہیں اسی طرح یہاں انسان

Marfat.com

—— اشرف المخلوقات بند کئے جاتے ہیں۔ یہ بھی انسانوں کا چڑیا گھر ہے۔

ہم نے کئی وارڈ گھوم کر دیکھے تھے۔ جو زیادہ پاگل نہ تھے انہیں کھلا رکھا گیا تھا۔ ہم جس وارڈ میں داخل ہوتے۔ تیلے کرتے نیلے تہمد پہنے بہت سے پاگل ہمیں گھیر لیتے۔ عجیب عجیب حرکتیں کرتے ہاتھ اور سر ہلاتے۔

"ہی ہی، ہاہا! ہو ہو، ہو ہو"!!

"صاحب! ایک پیسہ! اے صاحب۔ ایک پیسہ! ایک پیسہ"

"صاحب! ایک بیڑی! بیڑی! بیڑی۔ صاحب! صاحب! صاحب!" دوسرا آگے بڑھ کے کہتا۔

دار

ان پاگلوں کو جو انسانوں پر حملہ کر بیٹھتے تھے لوہے کی سلاخوں کوٹھریوں میں بند کر دیا گیا تھا۔ انہیں کھانا بھی اسی طرح دیا جاتا تھا جس طرح چڑیا گھر میں خونخوار جانوروں کو دیتے ہیں۔ ہم نے ایسے پاگل بھی دیکھے جنہیں بستر دیا گیا۔ انہوں نے اُسے چیر کر ٹکڑے ٹکڑے کر دیا تھا اور کوٹھری میں جگہ جگہ پاخانہ پیشاب کر دیا تھا۔ ننگ دھڑنگ بیٹھے تھے کوئی پرواہ نہ تھی۔

ایک پاگل کو کہیں سے چاک کا ٹکڑا مل گیا تھا کوٹھری کے فرش پر اس نے انگریزی میں معلوم نہیں کیا کیا لکھ دیا تھا۔ معلوم ہوا یہ ڈاکٹر تھا۔ ہمیں دیکھ کر انگریزی میں کچھ بڑبڑانے لگا۔ یہاں مجھے اپنے

Marfat.com

سے اور اپنے وجود سے نفرت ہو رہی تھی۔

ہم ایک پرائیویٹ وارڈ کیطرف بھی گئے تھے۔ ایک پاگل ملا کلام مجید پڑھ رہے تھے۔ ہمیں دیکھ کر چلائے "السلام علیکم"، ہم نے دور سے چلا کر جواب دیا "وعلیکم السلام"، اتنے میں ملازم نے ہمیں آگے بڑھنے سے منع کر دیا معلوم ہوا یہاں وہ پاگل رکھے جاتے ہیں۔ جن کے اعزا اخراجات برداشت کرتے ہیں۔!

آج ہم پاگل خانے کے دروازے پر کھڑے رہے۔ بڑی کوشش کی مگر دیکھنے کی اجازت نہ مل سکی۔ ہم بس کا انتظار کرنے لگے۔ مجھے شرارت سوجھی۔ پاگل خانے کے دروازے کے سامنے اپنے ساتھیوں کا فوٹو گروپ لینا چاہا۔ مگر کوئی راضی نہ ہوا۔ میں نے ایک چال چلی، سب پاگل خانے کے اندر جھانک رہے تھے۔ میں نے کیمرہ درست کر لیا اور کہا "دیکھئے۔!! میں آپ سب کا فوٹو لیتا ہوں"، جیسے ہی سب میری طرف دیکھنے کو مڑے میں نے فوراً بٹن داب دیا۔

"شکریہ"، اور سب ہنس دیئے "بڑے شیطان ہو"۔!! ہم نے بس پکڑی اور گھر آ گئے۔ دوپہر کا کھانا کھایا، تھوڑا آرام کیا چار بجے سب سے مل کر اسٹیشن روانہ ہو گئے۔ ایکسپریس ٹھیک وقت پر آیا۔

دریائے سندھ کا پل پار کرنے کے بعد کوٹری کا اسٹیشن آیا۔ یہاں گاڑی کافی دیر ٹھہرتی تھی۔ ہم نے چائے پی اور پلیٹ فارم پر ٹہلتے رہے ـــــ دھوپ پیلی پڑ چکی تھی۔ دور ـــ پہاڑیوں کے اوپر سورج جھک

Marfat.com

چلا تھا۔ گاڑی فراٹے بھرتی چلی جارہی تھی۔ چٹیل میدان، بنجر پہاڑیاں دور دور تک کسی بستی کا نشان نظر نہ آتا تھا۔ اندھیرا پھیلتا جارہا تھا۔ ہم جھمپیر پہنچے۔ کافی اندھیرا ہوگیا تھا۔ جنگ شاہی آیا اور گذر گیا۔

دور سے ہمیں سرخ روشنی نظر آرہی تھی یہ لانڈھی میں ہائی پاور ٹرانسمیشن پول کی روشنی تھی۔ لانڈھی آیا ملیر آیا اور گذر گیا۔ سیمابی قمقموں میں جگمگاتا ہوا کراچی ایئرپورٹ۔ ڈرگ روڈ۔ کراچی کینٹ۔

۱۸ر نومبر سنہ ۱۹۵۰ء
۲۶۲ انگل روڈ کراچی

Marfat.com

کراچی سے خیبر تک
چین
افغانستان
ایران
بھارت
لنڈی کوتل
پشاور
اٹک
ٹیکسلا
لائلپور
لاہور
ملتان
سکھر
موہنجو دارو
حیدرآباد
کراچی
کلومیٹر
میل

Marfat.com

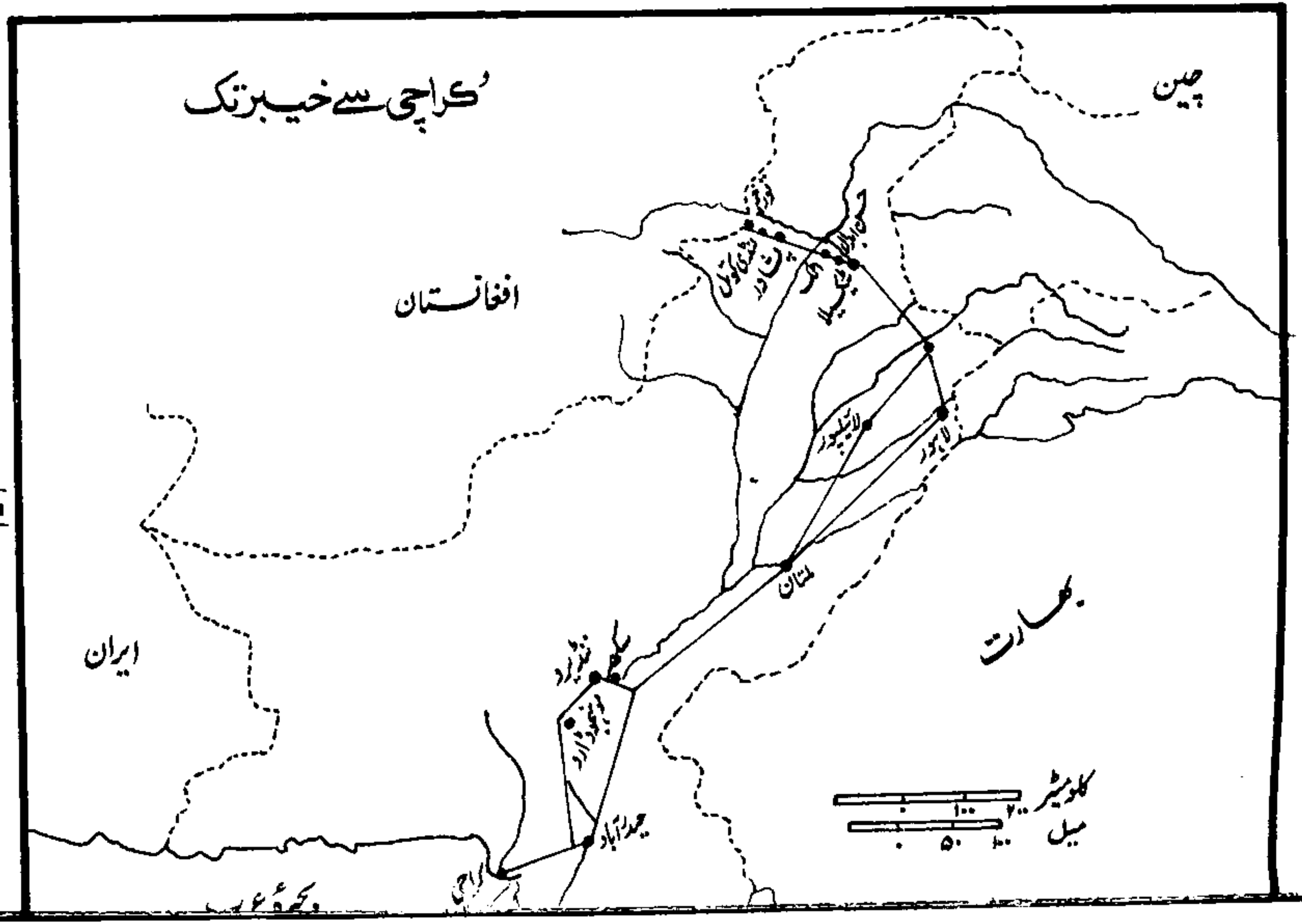

Marfat.com

# مفکر اسلام مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ

## کی چند اہم شاہکار تصنیفاتؒ


تاریخ دعوت و عزیمت مکمل (پانچ حصے)
مسلم ممالک میں اسلامیت اور مغربیت کی کشمکش
انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج و زوال کا اثر
منصب نبوت اور اس کے عالی مقام حاملین
دریائے کابل سے دریائے یرموک تک
تذکرہ فضل الرحمٰن گنج مراد آبادیؒ
تہذیب و تمدن پر اسلام کے اثرات و احسانات
تبلیغ و دعوت کا معجزانہ اسلوب
مغرب سے کچھ صاف صاف باتیں
نئی دنیا (امریکہ) میں صاف صاف باتیں
جب ایمان کی بہار آئی
مولانا محمد الیاسؒ اور ان کی دینی دعوت
حجاز مقدس اور جزیرۃ العرب
عصر حاضر میں دین کی تفہیم و تشریح
تزکیہ و احسان یا تصوف و سلوک
مطالعہ قرآن کے مبادی اصول
سوانح شیخ الحدیث مولانا محمد زکریاؒ
خواتین اور دین کی خدمت
کاروان ایمان و عزیمت
سوانح مولانا عبد القادر رائے پوریؒ

نبی رحمتؐ مکمل
حدیث کا بنیادی کردار
معرکۂ ایمان و مادیت
پرانے چراغ مکمل (دو حصے)
ارکان اربعہ
نقوش اقبال
کاروانِ مدینہ
قادیانیت
تعمیر انسانیت
حدیث پاکستان
اصلاحیات
صحبتے با اہل دل
کاروانِ زندگی مکمل
مذہب و تمدن
دستور حیات
حیات عبد الحیؒ
دو متضاد تصویریں
تحفۂ پاکستان
پاجا سراغ زندگی
عالم عربی کا المیہ



ناشر: فضل ربی ندوی — فون ۶۲۱۸۱۷ - ۶۲۰۸۹۶

مجلس نشریات اسلام ۱۔کے۔۳ ناظم آباد مینشن۔ ناظم آباد، کراچی ۱۸

Shah Noor Ph: 623176


Marfat.com